

# حقوق الزوین

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ  
لاہور — ڈھاکہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربعہ

معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

# حقوق الزوجین

جس میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد، نکاح و طلاق کے مسائل اور یورپ کے قوانین طلاق و فسخ و تفریق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی

www.KitaboSunnat.com

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای۔ شاہ عالم مارکٹ، لاہور (مغربی پاکستان)

لِلّٰهِ الْمُلْكُ كُلُّهُ

۹۹... جے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

نمبر

Handwritten notes in Urdu, possibly a library or collection mark.

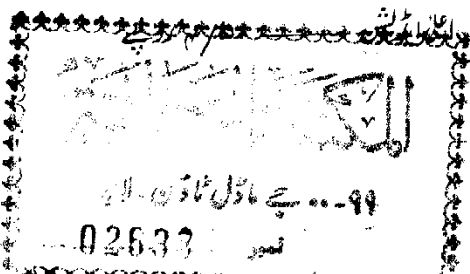
(محملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

طابع: اخلاق حسین، ڈاکٹر کٹر  
 ناشی: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ  
 ۱۳- اسی- شاہ عالم مارکٹ- لاہور  
 مطبع: جیلانی پریس- لاہور

(اشاعت :-)

|       |                |                  |
|-------|----------------|------------------|
| ۱۶۵۰۰ | ۱۹۴۳ء تا ۱۹۶۶ء | پہلی تا گیارھویں |
| ۲۰۰۰  | نومبر ۱۹۶۹ء    | بارھویں          |
| ۱۰۰۰  | جون ۱۹۶۱ء      | تیرھویں          |
| ۱۰۰۰  | نومبر ۱۹۶۶ء    | چودھویں          |

قیمت



## عرض ناشر

اسلام کے قانون ازدواج پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے کچھ کتب مغرب سے مرعوب ہو کر معذرت نامہ کے طور پر شائع کی گئی ہیں۔ اور کچھ کتب ہیں جو مسائل حاضرہ اور معاشرت جدیدہ کو قطعاً نظر انداز کر کے مرتب کی گئی ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے جدید معاشرتی مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسلامی احکامات کو نہایت مدلل اور جامع شکل میں پیش فرمایا ہے۔ علم و تحقیق کا یہ نادر نمونہ ملک و بیرون ملک ممتاز قانون دانوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

اب ہم اس گراں قدر تالیف کو آفسٹ کی نضیس طباعت پر پیش کر رہے ہیں تاکہ اس کی معنوی و صورتی خوبیوں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین اس کو پسند فرمائیں گے۔ اور حسب معمول اپنے گراں قدر تعاون سے نوازیں گے۔

نیاز مند

اخلاق حسین

ڈائریکٹر

ناہور

۴ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ

مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۶۴ء

# فہرس

|    |                               |    |                                   |
|----|-------------------------------|----|-----------------------------------|
| ۳۸ | ضرر اور تعدی                  | ۲  | عرضِ ناشر                         |
| ۴۰ | ازواج میں عدل نہ کرنا         | ۵  | دیباچہ                            |
| ۴۲ | مرد کے حقوق                   | ۹  | مقدمہ                             |
| ۴۶ | (۱) حفظِ لعیب                 | ۱۷ | قانونِ ازدواج کے مقاصد            |
| ۶۳ | (۲) شوہر کی اطاعت             | ۲۱ | مودت و رحمت                       |
| ۴۴ | مرد کے اختیارات               | ۲۴ | غیر مسلم سے ازدواجی تعلق کی قباحت |
| ۴۵ | (۱) نصیحت، تادیب اور تعزیر    | ۲۶ | مسئلہ کفالت                       |
| ۴۸ | (۲) طلاق                      | ۲۹ | اصولِ قانون                       |
| ۵۰ | ۲- اصل دوم                    | ۲۹ | ۱- اصلِ اول                       |
| ۵۱ | (۱) طلاق اور اس کی شرائط      | ۳۰ | مرد کے فرائض                      |
| ۵۸ | (۲) خلع                       | ۳۱ | (۱) مہر                           |
| ۶۳ | صدرِ اول کے نظائر و بابِ خلع  | ۳۳ | (۲) نفقہ                          |
| ۶۷ | احکامِ خلع                    | ۳۴ | (۳) ظلم سے اجتناب                 |
| ۷۱ | مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی | ۳۴ | ایلا-                             |

|     |                                      |     |  |
|-----|--------------------------------------|-----|--|
| ۱۱۹ | (۵) مہر                              | ۷۴  | مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات             |
| ۱۲۳ | (۶) نفقہ                             | ۷۹  | (۳) قضاء شرعی                              |
| ۱۲۶ | (۷) ستم ناروا                        | ۸۱  | قضاء شرعی کے متعلق چند اصولی مباحث         |
| ۱۲۷ | (۸) تنجیم                            | ۸۱  | قضا کے لئے اولین شرط                       |
| ۱۲۸ | (۹) عیوب میں خیار فسخ                | ۸۲  | قضا کے لئے اجتہاد کی ضرورت                 |
| ۱۳۱ | (۱۰) عین محبوب وغیرہ                 | ۸۲  | { ہندوستان میں قضا شرعی نہ ہونے کے نقصانات |
| ۱۳۵ | (۱۱) جنون                            |     |  |
| ۱۳۸ | (۱۲) مفقود الخیر                     | ۸۶  | اصلاح کی راہ میں پہلا قدم                  |
| ۱۳۲ | (۱۳) مذہب مالکی کے احکام پر اب مفقود | ۸۸  | { ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت          |
| ۱۳۶ | (۱۴) حکم بصورت والہی مفقود           |     |  |
| ۱۴۷ | (۱۵) لعان                            | ۹۷  | اصولی ہدایات                               |
| ۱۵۰ | (۱۶) تطبیقات ثلاثہ در مجلس واحد      | ۱۰۷ | مسائل جزئیہ                                |
| ۱۵۳ | خاتمہ کلام                           | ۱۰۷ | (۱) ارتداد احد الزوجین                     |
| ۱۵۶ | ضمیمہ ایک نہایت اہم استفتاء          | ۱۱۰ | (۲) خیار بلوغ                              |
| ۱۷۱ | { مرا بورپ کے قوانین طلاق و تفریق    | ۱۱۲ | (۳) ولایت اجبار                            |
|     |                                      | ۱۱۸ | (۴) خیار بلوغ کی شرائط                     |



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ طبع اول

۳۳-۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ جیدر آباد دکن، مہجوپال اور برطانوی ہند میں یہ مسئلہ بہت زور شور کے ساتھ اٹھا تھا کہ مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو خرابیاں رائج الوقت قانون کے نقائص کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں۔ ان کو دور کرنے اور، شرع اسلامی کے احکام کو صحیح طور پر نافذ کرنے کے لئے کوئی نتیجہ خیز سعی ہونی چاہیے چنانچہ اس سلسلے میں بہت سے مسودات قانون ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مرتب کئے گئے اور کئی سال تک ان کی بازگشت سنی جاتی رہی۔ اس زمانے میں مجھے محسوس ہوا کہ اس مسئلے کے بہت سے پہلو اور نہایت اہم پہلو ایسے ہیں جن پر کا حقہ توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ چنانچہ میں نے ۱۹۳۵ء میں حقوق الزوجین کے عنوان سے ایک طویل سلسلہ مضامین ”ترجمان القرآن“ میں لکھا اور اس میں اسلام کے قانون ازدواج کی روح اور اس کے اصول کی وضاحت کرنے کے ساتھ ان احکام کی تشریح کی جو معاملات زنی و شوہر کی اصلاح کے لئے ہم کو قرآن و حدیث میں ملتے ہیں اور چند ایسی تجاویز پیش کیں۔ جن سے مسلمانوں کی موجودہ قانونی مشکلات صحیح طریقہ سے حل ہو سکتی ہیں۔ یہ سلسلہ اصل میں نو علمائے کرام کی توجہ منقطع کرانے کے لئے لکھا گیا تھا۔ مگر اس میں بہت سے ایسے مباحث بھی آگئے تھے جن کا مطالعہ عام ناظرین کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جن لوگوں نے



میری کتاب "پردہ" ملاحظہ فرماتی ہے وہ خود بخود اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ تعلقات زن و مرد کو منضبط کرنے کے لئے اسلام نے جو قوانین مقرر کئے ہیں ان سے واقفیت حاصل کریں۔ تاکہ اس دین کا پورا نظام معاشرت ان کی سمجھ میں آسکے۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے اب اس سلسلہ مضامین کو بعض ضروری اصنافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ابوالاعلیٰ

۲۸ صفر ۱۳۶۲ھ - ۵ مارچ ۱۹۴۳ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ طبع چہارم

سترہ سال ہوئے کہ یہ کتاب ایک مسلسل مضمون کی شکل میں شائع کی گئی تھی اور دس سال سے یہ کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ اگرچہ اول روز ہی اس میں یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ فقہ حنفی کے ازدواجی منابطے میں جو اصلاحات اس کے اندر تجویز کی گئی ہیں، ان کی حیثیت فتوے کی نہیں بلکہ تجاویز کی ہے جو علماء کے سامنے اس غرض کے لئے پیش کی جا رہی ہیں کہ اگر وہ ان کو شرعی اور عقلی دلائل کے لحاظ سے درست پائیں تو ان کے مطابق فتوے میں تبدیلی کر دیں لیکن اس کے باوجود اس کی اشاعت کے پہلے روز سے آج تک نہ تو اس کی تجاویز پر سنجیدہ غور کیا گیا اور نہ کسی نے علمی تنقید کی تکلیف اٹھائی۔ البتہ اسے میرے خلاف فتنہ برپا کرنے کا ذریعہ پہلے بھی بنایا گیا تھا اور اب بھی بنایا جا رہا ہے۔ فالی اللہ المشتکی

اب نظر ثانی کے موقع پر بہت سی جزئی اصلاحات کیا تھیں نے اس کی دو بحثوں کو نسبتاً زیادہ مدلل کر دیا ہے جن کے دلائل پہلے زیادہ قوت کے ساتھ بیان نہیں کئے گئے تھے۔ ایک ایلام کی بحث دوسرے ولایت اجبار کی بحث۔ باقی کسی چیز میں مخالفین کی طعنہ زنیوں کے باوجود میں نے کسی تغیر کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ابوالاعلیٰ ۷ ارمضان ۱۳۸۶ھ - ۱۱ جون ۱۹۶۲ء

## مقدمہ

ہر سوسائٹی کے تمدن کی شیرازہ بندی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایسا جامع قانون جو اس کے مخصوص نظر تمدن کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو۔ دوسرے ایک ایسی ہیئت حاکمہ جو اس قانون کو ٹھیک ٹھیک اسی اسپرٹ میں نافذ کرنے والی ہو۔ جس میں وہ وضع کیا گیا تھا۔ بد قسمتی سے ہندوستان کے مسلمان اس وقت ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ بلاشبہ ان کے پاس کتابوں میں لکھا ہوا ایک قانون ضرور موجود ہے، جو اسلامی تمدن و تہذیب کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہے اور تمدن و معاشرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ مگر یہ قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون ان کے تمدنی معاملات پر فرمانروائی کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیتہً غیر اسلامی ہے۔ اور اگر کسی حد تک اسلامی ہے بھی تو ادھر مسلمان اس وقت جس نظام حکومت کے تابع ہیں اس نے عملاً ان کی تمدنی زندگی کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شعبہ وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی ایسے قوانین نافذ کر دیئے ہیں جو اسلامی تمدن کے مزاج سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتے

دوسرا شعبہ وہ ہے جس میں اس نے اصولاً مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔ مگر عملاً اس شعبہ میں بھی شرع اسلامی کا نفاذ صحیح طریق پر نہیں کیا جاتا۔ ”محمدی لا“ کے نام سے جس قانون کو اس شعبہ میں نافذ کیا گیا ہے وہ اپنی شکل اور روح دونوں میں اصل اسلامی شریعت سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کے نفاذ کو صحیح معنوں میں شرع اسلامی کا نفاذ نہیں کہا جاسکتا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان میں سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۵ فیصدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصہ کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا، جو اس تعلق کو منضبط کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ کیونکہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصہ میں یہ قانون کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں موثر ہوں گے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریکِ زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات کی بندشوں میں بندھے گی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک بہو بیٹے اور بیٹی و اماں کے تعلقات کی بہتری پر منحصر ہوگا۔ غرض قانونِ ازدواج ایک ایسا قانون ہے جو تو انہیں تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام

میں اس قانون کی اس حقیقی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر اس کی تدوین نہایت صحیح اصولوں پر کی گئی تھی اور مسلمانوں کو ازدواجی معاملات میں اپنے دین سے ایک ایسا صالح، جامع اور مکمل قانون ملا تھا جس کو دنیا کے قوانین ازدواج میں ہر حیثیت سے بہترین کہا جاسکتا ہے۔ مگر شومی قسمت سے یہ قانون بھی ”محمدن لا“ کی جھپیٹ میں آ گیا اور اس بڑی طرح مسخ ہوا کہ اس میں اور اصل اسلامی قانون ازدواج میں ایک بہت ہی بڑی مشابہت باقی رہ گئی ہے۔ اب شرح اسلامی کے نام سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو قانون نافذ ہے وہ نہ صالح ہے، نہ جامع، نہ مکمل۔ اس کے نقائص نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی پر اتنا بڑا اثر ڈالا ہے کہ شاید کسی دوسرے قانون نے نہیں ڈالا۔ مشکل ہی سے ہندوستان میں کوئی ایسا خوش قسمت خاندان مل سکے گا جس میں اس ناقص قانون کی بدلت کوئی زندگی تباہ نہ ہوئی ہو۔ زندگیوں کا تباہ ہونا تو پھر بھی ایک امر حقیر ہے اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس قانون کی خرابی نے بکثرت مسلمانوں کی عزت و ناموس کو تباہ کیا۔ ان کے اخلاق اور ایمان کو برباد کر ڈالا۔ اور جو گھر ان کے دین اور ان کی تہذیب کے محفوظ ترین قلعے تھے، ان میں بھی فواحش اور ارتداد کے سیلاب کو پہنچا دیا۔

تانون اور اس کو نافذ کرنے والی مشین کے نقائص سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان پر مزید خرابیوں کا اضافہ دو وجوہ سے ہوا۔ ایک دینی تعلیم و تربیت کا فقدان، جس کی بدولت مسلمان اسلام کے قانون ازدواج سے اس حد تک بیگانہ ہو گئے کہ آج اچھے اچھے تعلیم یافتہ

آدمی اس قانون کے معمولی مسائل تک سے ناواقف ہیں۔ تفصیلات تو درکنار اس کے اصول تک کو جاننے اور سمجھنے والے مسلمان بہت کم ملیں گے۔ سچی کہ وہ لوگ بھی جو عدالت کی کہ سیوں پر بیٹھ کر ان کے معاملات نکاح و طلاق کا تصفیہ کرتے ہیں، اسلامی قانون ازدواج کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ اس عام جہالت نے مسلمانوں کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ وہ بطور خود اپنے ازدواجی تعلقات میں اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک اتباع کر سکیں۔

رہی دوسری وجہ تو وہ غیر اسلامی تمدنوں کا اثر ہے۔ جس کی بدولت مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات میں نہ صرف بہت سے ایسے رسمیات اور رسمیات داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی قانون ازدواج کے اصول اور اس کی اسپرٹ کے

لے شمالی کے طور پر یہ جہالت ہی کا کرشمہ ہے کہ مسلمان بالعموم طلاق حینے کے صورت ایک ہی طریقہ سے واقف ہیں اور وہ یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں سے ڈالی جائیں۔ سچی کہ طلاق کی دستاویز لکھنے والے بھی جب لکھتے ہیں، تین ہی طلاق لکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں یہ بدعت اور سخت گناہ ہے اس سے بڑی قانونی پیچیدگیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ایک طلاق دینے سے وہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے، جس کے لئے تین طلاقیں دی جاتی ہیں۔ اور اس صورت میں عدت کے اندر رجوع کر کے اور عدت گزر جانے پر دوبارہ نکاح کر لینے کا موقع بھی باقی رہتا ہے۔ تو کتنے ہی گھر تباہ ہونے سے اور کتنے ہی بسندگانِ خدا بھوٹ اور جیلہ بازیوں اور دوسری متونِ شکیبوں سے بچ جاتے۔

خلاف ہیں۔ بلکہ سرے سے زوجیت کا اسلامی تصور ہی ان کی ایک بُری اکثریت کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ کہیں سند و تصور غالب آ گیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے کہ بیوی کو لڑائی اور شوہر کو آقا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ نکاح کی بندش اعتقاداً نہیں تو عملاً ناقابلِ فسخ ہے۔ طلاق اور خلع اس قدر محبوب ہو گئے ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہے وہاں بھی ان سے محض اس بنا پر اجتراز کیا جاتا ہے کہ کہیں ناک نہ کٹ جائے خواہ درپردہ وہ سب کچھ کیا جائے جو درحقیقت طلاق اور خلع سے زیادہ بدتر ہے۔ طلاق کو روکنے کے لئے ہر کی نقد اور اس قدر بڑھا دی گئی ہے کہ شوہر کبھی طلاق دینے کی ہمت ہی نہ کر سکے۔ اور منافرت کی صورت میں عورت کو معتق رکھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ "شوہر پرستی" عورت کے مغاخر اور اخلاقی فرائض میں داخل ہو گئی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی وہ محض سوسائٹی کی لعنتِ ملامت کے خوف سے طلاق یا خلع کا نام زبان پر نہیں لاسکتی۔ حتیٰ کہ اگر شوہر مر جائے۔ تب بھی اس کا اخلاقی فرض یہ ہو گیا ہے کہ ہندو عورتوں کی طرح اس کے نام پر بیٹھی رہے۔ کیونکہ بیوہ کا نکاح ثانی ہونا نہ صرف اس کے لئے بلکہ اس کے سارے خاندان کے لئے موجب ذلت ہے۔

دوسری طرف جو نسلیں فرنگی تہذیب سے متاثر ہوئی ہیں، اُن کا حال یہ ہے کہ وہ لَکُنْ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ طے تو بڑے زور سے کہتے ہیں، مگر لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ طے پر پہنچ کر دعتہ ان کی آواز دب جاتی ہے اور

لے عورتوں کو بھی حسنِ سلوک کا دیسا ہی حق ہے جیسا مردوں کو ان پر حاصل ہے۔

لے مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ زیادہ حاصل ہے۔



اور جب الرَّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کا فقرہ ان کے سامنے آتا ہے تو ان کا بس نہیں چلنا کہ کس طرح اس آیت کو قرآن سے خارج کر دیں۔ عجیب عجیب طریقہ سے اس کی تاویلیں کرتے ہیں اور تاویل کا انداز کہہ دیتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر سخت شرمندہ ہیں کہ ان کے مذہب کی مقدس کتاب میں یہ آیت پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فرنگی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو تصور پھینکا ہے اس سے وہ وحشت زدہ ہو گئے ہیں اور ان کے دماغوں میں اُن مٹھوس اور مستحکم عقلی اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، جن پر اسلام نے اپنے نظام معاشرت کو قائم کیا ہے۔ ان مختلف اسباب نے مل جل کر مسلمانوں کی خاندانی زندگی کو اتنا ہی بدتر کر دیا ہے جتنی وہ کسی زمانہ میں بہتر تھی۔ بھالت اور اجنبی تمدنوں کے اثر سے ان کے ازدواجی معاملات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو سلجھانے سے موجودہ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والی مشین سراسر قاصر ہے۔ بلکہ اس کے تصور نے ان پیچیدگیوں پر بہت سی مزید الجھنوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ نادانفیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ان تمام خرابیوں کی وجہ اسلامی قانون کا نقص ہے۔ اسی لئے ایک نئے قانون کی تدوین پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام میں ایک ایسا مکمل ازدواجی قانون موجود ہے جس میں زوجین کے لئے انصاف کے ساتھ واضح حقوق متعین کئے گئے

۱۔ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

ہیں۔ ان حقوق کی حفاظت کا اور تعدی کی صورت میں (خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے) دادرسی کا پورا انتظام کیا گیا ہے اور ایسی کوئی چھیدگی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کو عدلی کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔ لہذا مسلمانوں کو کسی نئے قانون کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصلی ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج اپنی صحیح صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے علماء کا فرض ہے کہ تقبید جامد کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام کے قانون ازدواج کو ایسی صورت میں مدون کریں کہ مسلمانوں کے ازدواجی مسائل کی موجودہ پیچیدگیوں کو پوری طرح حل کیا جاسکے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی جانی چاہیے تاکہ وہ اپنے نظام معاشرت کو ان جہلانہ رسموں اور اُن حب الہی تصورات سے پاک کریں جن کو انہوں نے غیر اسلامی تمدنوں سے اخذ کیا ہے اور اسلامی قانون کے اصول اور اسپرٹ کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے معاملات انجام دیں۔ پھر ایک ایسا نظام عدالت درکار ہے جو خود اس قانون پر ایمان رکھتا ہو اور جس کے منصفوں کو علمی اور اخلاقی حیثیت سے وہ تربیت دی گئی ہو جو اس قانون کو دنیا کے دوسرے قوانین کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ اس کی اپنی اسپرٹ میں نافذ کریں۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر لکھا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسلامی قانون ازدواج کا ایک پورا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اس

تمازوں کے مقاصد، اصول اور احکام سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی۔ حسب ضرورت ہم تشریح کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے فیصلوں کی نظیریں اور ائمہ سلف کی اجتہادی آراء بھی نقل کریں گے تاکہ ان سے جزئی مسائل مستنبط کرنے میں آسانی ہو آخر میں چند ایسی تجویزیں پیش کی جائیں گی، جن سے اصول شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی الجھنیں کسی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ ان الجھنوں کا اصلی اور صحیح علاج صرف اسلامی حکومت اور قضائے شرعی کا قیام ہے۔ لیکن ہم محض بسبب تنزل وہ کم سے کم صورتیں بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں جن سے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی خرابیاں نسبتاً ایک صحیح شرعی طریقے سے رفع کی جاسکتی ہیں، تاکہ جو لوگ ان مسائل کے حل کی کوشش کر رہے ہیں وہ غلط سمت میں اقدام کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کریں جو کچھ شریعت کے مطابق ہو۔

## قانون ازدواج کے مقاصد

قانون کی تفصیلات سے پہلے مقاصدِ قانون کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لئے اصول مقرر کئے جاتے ہیں اور اصولوں کے ماتحت احکام دیئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھ بغیر احکام نافذ کرے گا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزئی مسئلہ میں وہ ایسا حکم نافذ کرے، جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہو گا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہذا اہم پہلے ان مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لئے اسلام میں ازدواج کا قانون مقرر کیا گیا ہے۔

### اخلاق و عفت کی حفاظت

اسلامی قانون ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطے کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو بخش اور بے حیائی سے اور تمدن کو نساہ سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لئے قرآن مجید میں نکاح کو لفظِ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حسنِ قلعہ کو کہتے ہیں اور احسان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح

کرنا ہے وہ "محسن" ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ "مُحْسَنَةٌ" ہے۔ یعنی اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صحت ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولیٰ مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانون ازدواج کا پہلا کام اُس قلعہ کو مستحکم کرنا ہے جو نکاح کی صورت میں اس گراں قدر چیز کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے -

دیر عورتیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں، ان کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لئے نہیں۔ بلکہ تیر نکاح میں لانے کے لئے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَهُ  
ذَ الْكُفْرَانِ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ  
مُحْسِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ -  
(النساء - ۴)

پھر عورتوں کے لئے کہتا ہے -

پس تم ان کے سر دھروں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرو، اور مناسب طور پر ان کے ہراؤ کرو۔ تاکہ وہ محسنات بنیں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں۔

فَأَنْكِحُوا هُنَّ بِأَرْبَابِنَ أَهْلِهِنَّ  
وَ أَنْتُمْ هُنَّ أُجُورُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ  
مُحْسِنَاتٍ غَيْرِ مُسَافِحَاتٍ وَلَا  
مُتَّخِذَاتٍ أَخْدَانٍ -  
(النساء - ۴)

دوسری جگہ ارشاد ہے -

الْيَوْمَ أُعِدَّ لَكُمْ الظِّبْيَاتُ ... آج تمہارے لئے تمام پاک چیزیں حلال کی  
 وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أَوْلَوْا گئیں اور باعفت عورتیں خواہ وہ مومن ہوں یا  
 الْكِتَابِ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِنَّا أَنْتَمُوهَا اہل کتاب میں سے، بشرطیکہ تم ان کے  
 هُنَّ أَجْزَاءُ رَهَقٍ مُحْصَنِينَ غَيْرَ مہر ادا کر کے قید نکاح میں لانے والے ہو  
 مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات  
 (المائدہ - ۵۱) پیدا کرنے والے۔

ان آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی  
 نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق  
 میں احسان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد  
 ہے جس کے لئے ہر دوسری غرض کو قربان کیا جاسکتا ہے۔ مگر کسی دوسری غرض کے  
 لئے اس کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لئے مقید کیا جاتا  
 ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطری خواہشات  
 پوری کریں۔ لیکن اگر کسی قید نکاح میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود  
 اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو، تو سبائے اس کے کہ نکاح کی ظاہری قید کو برقرار رکھنے  
 کے لئے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر  
 ایسی قید نکاح کو قربان کر دیا جائے۔ اسی لئے ایلا کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ چار  
 مہینہ سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں، اور اگر وہ چار مہینے کی مدت گزرنے پر  
 بھی رجوع نہ کریں تو انہیں ایسی عورت کو نکاح میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس  
 سے وہ ہم بستر نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ عورت اپنے

واعیاتِ نظرت کو پورا کرنے کے لئے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہوگی جسے اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ فَلَا تَعْمَلُوا الْاَمَلِیْلَ فَمَنْ دُوِّهَا کَا مُعْلَقَةٍ۔ یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری عورت کو یا معلق رہ جائے اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ کوئی عورت ایسی حالت میں مبتلا نہ ہونے پائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو۔ ایسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لئے آزاد ہو جائے۔ پھر عورت کو خلع کا حق بھی اسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ ایک عورت کا کسی ایسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش نہ ہو، یا جس سے اس کے نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دینا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے۔ اس لئے ایسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اس کا مال، جوہر کی صورت میں اسے ملا تھا، یا اس سے کم زیادہ دے کر قید نکاح سے رہائی حاصل کر لے۔ قانون اسلامی کی ان دفعات کو اسکے چل کر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا مگر یہاں ان مثالوں کے بیان کرنے سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی قانون نے اخلاق و عفت کی حفاظت کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دی ہے اگرچہ وہ قید نکاح کو حتمی الامکان ہر طریقے سے مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جہاں اس قید کے برقرار رہنے سے اخلاق و عفت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو وہاں اس متاعِ گراں مایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کو کھول دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلامی قانون کی



جو دفعات آئندہ بیان کی جائیں گی ان کو سمجھنے اور ان کو قانون کی اسپرٹ کی مطابقت نافذ کرنے کے لئے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

### مودت و رحمت

دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازواج کا تعلق مودت و رحمت کی بنیاد پر ہوتا کہ مناکحت سے تمدن و تہذیب کے جو مقاصد متعلق ہیں ان کو وہ اپنے اشتراکِ عمل سے بدرجہ اتم پورا کر سکیں اور ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت و مسرت اور سکون و آرام حاصل ہو سکے جس کا حصول انہیں تمدن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لئے ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زوجیت کا تصور ہی مودت و رحمت ہے۔ اور زوجین بنائے ہی اس لئے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً۔

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

(الروم - ۳)

اور دوسری جگہ فرمایا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ

نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا

وہی ہے جس نے تم کو تین واحد سے پیدا کیا

اور اس کیلئے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا

ذُو جَبَّالٍ لَيْسَ كُنَّ اِلَيْهَا (اعراف ۲۴) بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے

پھر ایک دوسرے پیرایہ میں زوجیت کے اس تصور کو یوں پیش کیا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَاَنْتُمْ

لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ ۲۳) لئے لباس۔

یہاں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔ لباس وہ چیز ہے جو انسان کے جسم سے متصل رہتی ہے اور اس کی پردہ پوشی کرتی ہے اور اس کو خارجی فضا کے مضر اثرات سے بچاتی ہے۔ اس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لئے استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے ویسا ہی تعلق ہونا چاہیے جیسا جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے دل اور ان کی روحیں ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہوں، وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کریں۔ اور ایک دوسرے کو ان اثرات سے بچائیں، جو ان کی عزت اور ان کے اخلاق پر حرج لانے والے ہوں۔ یہی مقصد ہی ہے مودت و رحمت کا اور اسلامی نقطہ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصلی روح ہے اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ شرح نہیں ہے تو گویا وہ ایک بے جان لاش ہے۔

اسلام میں ازدواجی تعلقات کے لئے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان سب میں

اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ زوجین اگر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، تو صلح و

اشتہی، محبت اور رومی یک جہتی کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، اور

آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں۔ لیکن وہ اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان کی یک

جانی سے جدائی بہتر ہے۔ کیونکہ مودت و رحمت کی روح نکل جانے کے بعد ازدواجی

تعلق ایک مردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفو نہ پیدا ہوگی، اور اس سے خانگی زندگی کی ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی۔ اسی لئے قرآن مجید کہتا ہے۔

وَإِنْ تَضَلُّوْا ذَاتَ نَفْسٍ أَوْ أَنْتَفَرْتُمْ  
اللَّهُ كَانَ عَافُوْرًا رَّحِيْمًا وَإِنْ  
يَتَفَرَّقَا يَغْنِ اللَّهُ كِلَيْهِمَا مِنْ  
سَمْعِهِ

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے سے زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر (یر نہ ہو سکے) اور زردہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانہ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرے گا۔

(النساء- ۱۹)

پھر جگہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ۔

فَاْمْسَاكٌ بِمَعْرُوْبٍ اَوْ  
تَسْوِيْحٌ بِاِحْسَانٍ۔

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھا جائے یا احسان (خوش سلو بی) کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

(بقرہ- ۲۹۰)

فَاْمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْبٍ اَوْ فَاْرِقُوْهُنَّ  
هُنَّ بِمَعْرُوْبٍ (الطلاق- ۱)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھو یا بھلے طریقہ سے ان سے جدا ہو جاؤ۔

وَعَاثِرُوْهُنَّ بِاَلْمَعْرُوْبِ

(النساء- ۳)

فَاْمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْبٍ اَوْ  
سَرَّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْبٍ وَّلَا  
تَمْسِكُوْهُنَّ ضِرًا اِلَّا لَتَعْتَدُوْا

یا تو بھلے مانسوں کی طرح ان کو رکھو یا بھلے مانسوں کی طرح رخصت کر دو۔ محض ستانے کیلئے ان کو نہ زور رکھو کہ ان کی حق تلفی کرنے

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ  
ظَلَمَ نَفْسَهُ

لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر  
خود ظلم کرے گا (یعنی اپنے آپ کو خدا کے  
عذاب کا مستحق بنائے گا)

(بقرہ ۲۹)

وَلَا تَسْأَلُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ

اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ پھیلو  
(یعنی فیاضی کا برتاؤ کرو)

(بقرہ - ۳۱)

طلاقِ رجعی کے احکام جہاں بیان کئے گئے وہاں رجوع کے لئے نیک نیتی  
کی شرط لگادی گئی۔ یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو یہ حق تو  
ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و اُشتی  
کے ساتھ رہنے کی ہو نہ کہ ستانے اور لڑکانے رکھنے کی۔ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ  
بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا۔ (البقرہ - ۲۸)

غیر مسلموں سے ازدواجی تعلق کی قباحت

یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے تمام ان غیر مسلموں سے  
ازدواجی تعلق کو ممنوع کر دیا گیا ہے جو اہل کتاب نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے مذہب  
اپنے خیالات، اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے طور طریقوں میں مسلمانوں سے  
اتنے مختلف ہیں کہ ایک حقیقی مسلمان کا دلی محبت اور قلب و روح کی بیک بہتی  
کے ساتھ ان سے میل نہیں ہو سکتا۔ اگر اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے  
کے ساتھ جوڑے جائیں تو ان کا ازدواجی رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا بلکہ محض  
ایک شہوانی رشتہ بن جائے گا۔ اور اس میں یا تو مودت و رحمت نہ ہوگی یا اگر ہو  
گی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے اور خود اس مسلمان کے لئے مفید ہونے کے

بجائے الٰہی مضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَسْكُمُوا الْمَشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ وَلَا مَٔ  
مُؤْمِنَةٍ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَكَوْنًا حُجَّجًا بِكُمْ وَلَا  
تَسْكُمُوا الْمَشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَكَعْبِدًا مِّنْ  
نَحْيٍ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَكَوْنًا حُجَّجًا بِكُمْ (البقرہ - ۲۰)

مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک  
مومن لونڈی ایک مشرک شریعت زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند  
ہو اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ  
ایمان نہ لے آئیں ایک مومن غلام ایک مشرک شریعت زادے سے  
بہتر ہے۔ اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔

اہل کتاب کے معاملہ میں اگرچہ قانون اسکی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں  
سے نکاح کر لیا جائے۔ کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور  
اہل کتاب مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح پھر بھی ممنوع ہے کیونکہ عورت کی فطرت میں  
اثر پذیریری اور قبولیت کا مادہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اس لئے ایک غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی میں غیر  
مسلم شوہر کیسا تھ اس کے رہنے سے یہ خطرہ زیادہ ہے کہ وہ انکار رنگ اختیار کر لے گی اور یہ توقع بہت  
کم ہے کہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ نیز اگر وہ ان کا اثر قبول نہ کرے تو یہ یورپین ہے کہ  
اس کا یہ رشتہ محض ایک شہوانی رشتہ بن کر رہ جائے گا۔ غیر مسلم شوہر سے وہ عورت درجعت  
کیسا تھ بیوستہ ہو سکے گی اور نہ غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی کے ساتھ اس کا کوئی مفید  
تقدنی رابطہ قائم ہو سکے گا۔



یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَلْبِیِّنَاتُ کَافِرَاتٌ کُوْنُوْنَ کَیۤسَیۤا اَسٰیۤا مِیۤنَ کُوْنُوْنَ اَلِیۤسَیۤا حٰیۤرَۃً  
جو اسکو اس عورت نکاح کی رغبت دلایا تو وہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نکاح کے معاملہ میں کفار ت (ہمسری) کو ملحوظ رکھنا پسند کرتی ہے اور غیر کف میں نکاح کو مناسب نہیں سمجھتی۔ جو عورت اور مرد اپنے اخلاق میں، اپنی دینداری میں، اپنے خاندان کے طرز طریقوں میں، اپنی معاشرت اور رہن سہن میں، ایک دوسرے سے مشابہت یا کم از کم قریبی مشابہت رکھتے ہوں، ان کے درمیان عودت و رحمت کا رابطہ پیدا ہونا زیادہ متوقع ہے اور ان کے باہمی ازدواج سے یہ بھی توقع کی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کے خاندان بھی اس رشتہ کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو سکیں گے۔ بخلاف اس کے جن کے درمیان یہ مشابہت موجود نہ ہو، ان کے معاملہ میں زیادہ تر اندیشہ یہی ہے کہ وہ گھر کی زندگی میں، اور اپنے قلبی و روحی تعلق میں، ایک دوسرے سے منقل نہ ہو سکیں گے اور اگر شخصاً میاں اور بیوی باہم متصل ہو بھی جائیں تو کم ہی یہ امید کی جاسکتی ہے کہ دونوں کے خاندان آپس میں مل سکیں۔ شرع اسلامی میں مسئلہ کفارت کی یہی اصل ہے۔

مندرجہ بالا مشالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانت اخلاق و عفت کے بعد دوسری چیز جو اسلام کے قانون ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زوجین کے درمیان عودت و رحمت ہے۔ جب تک ان کے تعلقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی امید ہو، اسلامی قانون ان کے رشتہ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے۔ مگر جب یہ عودت و رحمت باقی نہ رہے اور اس



کی جگہ بے دلی، سردہری، نفرت اور بیزاری پیدا ہو جاتے، تو قانون کا میلان  
رشتہ نکاح کی گرہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اس  
قابل ہے کہ اس کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ کیوں کہ جو لوگ اس کو نظر انداز کر  
کے قانونِ اسلام کے اصولوں کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں وہ قدم قدم پر ایسی  
غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

---

# اصولِ قانون

قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی قانون ازدواج کی تدوین کن اصولوں پر کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں، جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

## اصلِ اول

اصولِ قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے۔

وَالرِّجَالُ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ

عَلَى بَعْضٍ ذَرَجَةً ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَلِلصَّالِحَاتِ

مُحَقَّقَاتٍ حَقٌّ مِمَّا لِّلرِّجَالِ مِنَ الْمَالِ ۗ (النساء-۶)

”مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کے دوسرے پر فضیلت

دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک

عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں

بتوفیقِ الہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔“

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو توأم کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ تالون کی نہیں۔ فلسفہ اجتماع کی بحث ہے۔ اپنے موضوع کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لئے بہر حال زوجین میں سے ایک کو توأم اور صاحبِ امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی اختیارات رکھنے والے ہوں تو بنیظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ جیسی کہ فی الواقع اُن قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک نظری مذہب ہے اس لئے کہ اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو توأم اور صاحبِ امر، اور دوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا اور توأمیت کے لئے اُس فریق کا انتخاب کیا جو فطرتاً ہی مجھلے کہ پیدا ہوا ہے۔

مرد کے فرائض :-

پس اسلامی تالون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس میں مرد کی حیثیت توأم کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسبِ ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

لے توأم (Sustainer, Provider) حاکم، محافظ  
سربراہ کار، معاملات کا منتظم اور نگران (Protector)  
لے اس بحث کو اگر کوئی صاحبِ مفصل دیکھنا چاہے تو میری کتاب ”پردہ“ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) مہر۔ یہ کہ وہ عورت کا ہر ادا کرے۔ کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوقِ زواجیت حاصل ہوتے ہیں وہ مہر کا معاوضہ ہیں۔ اور جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مرد ہی تو آیت کا مستحق ہے مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے۔ مثلاً

وَأَتُوا النِّسَاءَ مَدُّ قَتِهَتْ  
اور عورتوں کے مہر خوشی دہلی کے ساتھ  
بِحِلَّةٍ (النساء - ۱) ادا کرو۔

وَأَحِلَّ لَكُمْ مِمَّا رَزَاكَ الْكِتَابُ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ  
مُحْمِنِينَ غَيْرَ مَسْأَلِينَ لِمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ  
فَأَنْتُمْ لَهُنَّ أَجُورَهُنَّ فَرِيضَةٌ (النساء - ۴)

ان عورتوں کے سرا باقی سب عورتوں کے لئے حلال کی گئیں تاکہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو حاصل کرنے کی خواہش کرو۔ قید نکاح میں لانے کے لئے نہ کہ آزلا شہوت رانی کے لئے۔ پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے بدلے میں قرار داد کے مطابق ان کے ہر ادا کرو۔

فَأَنْتُمْ لَهُنَّ أَجُورَهُنَّ بِأَرْزَنِ أَهْلِهِنَّ  
وَأَنْتُمْ لَهُنَّ أَجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (نساء - ۴)

پس لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ اور مناسب طور پر ان کے ہر ادا کرو۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ  
وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ

اور حلال کی گئیں تمہارے لئے عورت دار  
عورتوں مومنوں میں سے اور عورت دار عورتوں

مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ اجْزَوْا  
هُنَّ - (مآخذہ ۷-۱)

اُن لوگوں میں سے جن کے پاس تم میں سے پہلے  
کتاب صحیحی جا چکی ہے جبکہ تم ان کے ہب ادا کرو۔

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان ہب کی جو قرار داد ہوتی ہو اس کو  
پورا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اگر وہ اس قرار داد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو  
حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش  
ہونے کی کوئی صورت مرد کے لئے بجز اس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اس کو مہلت  
دے۔ یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کر دے، یا اس پر احسان کر کے برضا  
رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَإِنْ طَبِقَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا  
پھر اگر وہ خوش دلی کیساتھ ہب میں سے کچھ

لے۔ اسی کو ہب موصول کہتے ہیں۔ مگر آج کل ہب موصول کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ نکاح کے وقت ہب ادا  
لاکھوں کی دستاویز یہ سمجھ کر لکھی جاتی ہے کہ کون لیتا ہے کون دیتا ہے۔ گویا ابتدا ہی سے  
ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جاتے وہ عند اللہ  
فاسد ہے۔ حقیقی ہب موصول وہ ہے، جس میں واضح طور پر مدت کا تعین کیا گیا ہو کہ مرد  
اتنی مدت میں اسے ادا کرے گا۔ اور جس ہب کی قرار داد میں مدت کا تعین نہ ہو وہ  
عند الطلب (On Demand) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے ان فقہاء سے سخت  
اختلاف ہے جو ایسے ہب کو شوہر کی وفات کے بعد واجب الادا بتاتے ہیں۔ گویا نکاح تو شوہر  
کرے اور ہب اس کے وارثوں پر عائد ہو۔ یہ چیز مذکورہ بالا آیات قرآنی کی روح کے بالکل خلاف  
ہے اور اس فتوے کیلئے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

نکحوا هتیا مریا (النساء - ۱)  
 وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا  
 تَرَاضْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِضَةِ  
 (النساء - ۴)

صحت کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔  
 اور اگر تم قرار داد کے بعد اس میں کم زیادہ  
 پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو  
 اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۲) نفقہ - شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے۔ قانون اسلام نے زوجین کے حدود و عمل کی  
 واضح طور پر تقسیم کر دی ہے۔ عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض  
 انجام دینا ہے (وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ) اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لئے  
 ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر شوہر کو اپنی بیوی  
 پر نفیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے اور یہ چیز قومیت کے عین مفہوم میں داخل ہے۔  
 قوم کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو کسی شے کی نگہبانی اور نگرہری کرنے والا ہو۔ اور اسی  
 حیثیت سے اس شے پر اقتدار رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت التَّوَّجَّالِ تَوَّامُونَ  
 عَلَى النَّسَاءِ میں دیکھا اَنْفَعُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت  
 ہوتا ہے۔ اسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر شوہر اس ذمہ داری کو  
 ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکار یا بصورت  
 عدم استطاعت، اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی  
 خواہشات پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآن مجید نے اس  
 بارے میں ایک تاملہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَى الْمَوْسِعِ قَدْرُهَا وَحَلَى  
 الْمُقْتَرِ قَدْرُهَا۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر  
 اس کی استطاعت کے مطابق۔ یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے

جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو، یا مال دار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔  
 اس ظلم سے اجتناب۔

مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو تہ جمعی حقوق اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً ایلاسا۔

عورت کے وعیاتِ نفس کو پورا کرنے سے کسی عذر جائزہ کے بغیر اعراض کرنا جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لئے قانونِ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلقِ زین و شوہر قائم کرے۔ ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو جمبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِّلَّذِينَ يُؤَلُّونَ مِن نِّسَاءِهِمْ تَرِيصَ اَرْبَعَةِ اشْهُرٍ فَاِنْ فَازَا وَفَاتَ اللّٰهُ عَفْوٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (بقرہ - ۲۸)

جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کر لیں تو اللہ سننے والا ہے۔

لے عذر جائزہ سے مراد ہے مرد یا عورت کی بیماری۔ یا مرد کا حالتِ سفر میں ہونا یا کوئی ایسی صورت پیش آجانا جس میں مرد اپنی بیوی کی طرقتِ رشیت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے کا موقع نہ ہو۔

اس مسئلہ میں بعض فقہانے حلف کی شرط لگائی ہے، یعنی اگر شوہر نے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلا رہوگا۔ اور یہ حکم جاری کیا جائے گا۔ لیکن اگر قسم نہیں کھائی، تو خواہ وہ بیوی سے ناراض ہو کر دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے، اُس پر ایلا کا اطلاق نہ ہوگا۔ لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میرے دلائل حسب ذیل ہیں۔

اول یہ کہ قرآن مجید اگر کسی خاص صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم دے اور ایسے الفاظ استعمال کرے جن کا اطلاق اسی صورتِ معاملہ پر ہوتا ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حکم کا اطلاق اسی صورتِ معاملہ پر ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن نے سوتیلی بیٹی کو اس کے باپ پر حرام کرنے کے لئے جو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ یہ ہیں **وَرَبَائِبُ كُمُ الشَّعْبِ فِي حَبْوٍ لِّرِجْمٍ** اور تمہاری وہ پروردہ لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے۔ اس سے صرف ان لڑکیوں کے حرام ہونے کا حکم نکلتا ہے جو چھوٹی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ سوتیلے باپ کے گھر آئی ہوں۔ مگر کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ یہ حکم صرف اسی صورت کے لئے خاص ہے۔ بلکہ سب اُس لڑکی کے حرام ہونے پر بھی متفق ہیں جو سوتیلے باپ سے اپنی ماں کے نکاح کے وقت جوان ہو اور جس نے ایک دن بھی اُس باپ کے گھر میں پرورش نہ پائی ہو۔ اسی طرح اگر قرآن نے لفظ **يَوْمُ تُونَ مِنْ نِسَاءِ هِمَّ** (بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھالیتے ہیں) کے الفاظ استعمال کئے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کے لئے جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ صرف قسم کھانے والے لوگوں ہی کے لئے خاص ہو۔



دوہم یہ کہ احکام فقہیہ کے استنباط میں یہ اصول قریب قریب ساری امت میں متفق علیہ ہے کہ جس صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم نہ پایا جاتا ہو، اس کو کسی ایسی صورتِ معاملہ پر تیس کیا جاسکتا ہے جس کے بارے میں حکم موجود ہو۔ بشرطیکہ دونوں میں علتِ حکم مشترک ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ شارع نے ایلاہ کرنے والوں کے لئے چار عینے کی مدت کس لئے مقرر کی ہے؟ اور کیوں یہ فرمایا ہے کہ اگر اس مدت کے اندر رجوع نہ کرو تو پھر طلاق دے دو؟ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتائی جاسکتی ہے کہ چار عینے سے زیادہ مدت تک مقاربت سے پرہیز کرنا عورت کے لئے موجبِ ضرر ہے اور شارع ضرر ہی کو روکنا چاہتا ہے؟ اسی آیت سے اگلے رکوع میں شارع کا یہ ارشاد موجود ہے کہ **وَلَا تَنْسَوُوهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَشَدِيْدٌ** (ان کو محض ضرر کے لئے نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی نہ کرو) اور سورہ نسا میں شارع فرماتا ہے **فَلَا تَمِيْلُوْا** **كُلَّ الْمَيْلِ فَتَنْزِلُوْهُمَا كَالْعُلُقَةِ** (پس ایک ہی بیوی کی طوت پوری طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو) ان اشارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو نکاح میں بھی رکھنا اور پھر اسے معلق رکھ چھوڑنا اور محض تنانے کے لئے روک رکھنا شارع کو پسند نہیں ہے۔ اس کے سوا چار عینے کی مدت مقرر کرنے کی کوئی دوسری علت بیان نہیں کی جاسکتی۔ اب اگر یہی علت اس صورت میں بھی پائی جاتی ہو جب کہ شوہر قسم کھائے بغیر بیوی سے قصداً مباشرت کرنا چھوڑ دے تو کیوں نہ اس پر بھی یہی حکم نافذ کیا جائے؟ آخر قسم کھانے یا نہ کھانے سے نفسِ ضرار میں کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ شوہر قسم کھا کر ترکِ مباشرت کرے تو ضرر ہوگا۔ اور اگر اس نے قسم نہ کھائی ہو تو ساری عمر بھی اس بیوی کے پاس



کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اس معنی میں منقول ہے۔ مگر ایک دوسرا قول جو موخر الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ اپنی بیوی سے رجوع کرے و یا اس کو طلاق دے۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایلاء کرنے والوں کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہی ہے۔ اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز طلاق اور جدائی کے اور کوئی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے تو گو یا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے، اور یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے۔

### ضرر اور تعدی :-

عورت سے رغبت نہ ہو، اس کو رکھنا نہ چاہے، مگر محض تسانے اور زیادتی کرنے کے لئے اس کو رکھ چھوڑے۔ بار بار طلاق دے اور دو طلاقیوں کے بعد تیسرے طلاق سے پہلے رجوع کر لے۔ قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ یہ بھی ظلم ہے۔

وَلَا تَنْسِكُوا احْتِنَ بِيْرَارٍ لِّتَتَّخِذُوْا

اور ان کو تسانے اور زیادتی کرنے کے لئے

لے یہ امر مختلف فیہ ہے کہ یہ طلاق، ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے یا رجعی کے حکم میں :-

دَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا  
 نہ روک رکھو۔ جو ایسا کرے گا۔ وہ اپنے  
 اُوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا  
 مذاق نہ بناو۔ (۲۹)

ضرر اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور  
 زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے  
 گا۔ روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا۔ ادنیٰ طبقہ کا ہو گا تو مار پیٹ اور گالم گلوچ کرے گا۔  
 اونچے طبقے کا ہو گا تو تندی لے لے اور ایذا رسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرر اور  
 تعدی کے الفاظ سب پر حاوی ہیں اور قرآن مجید کی رو سے یہ سب افعال ممنوع ہیں

لے قانون کے الفاظ سے ایسا ناجائز فائدہ اٹھانا جو قانون کے مقصد اور اس کی روح کے خلاف  
 ہو، دراصل قانون سے کھیلنا اور اس کا مذاق بنانا ہے۔ قرآن میں مرد کو ایک طلاق یا دو  
 طلاق دے کر رجوع کر لینے کا جو حق دیا گیا ہے وہ صرف اس غرض کے لئے ہے کہ اگر اس  
 دوران میں زوجین کے درمیان مصالحت ہو جائے اور ان کے باہم مل جل کر رہنے کی کوئی  
 صورت نکل آئے تو شریعت کی طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی  
 شخص اس گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق دے۔ پھر عدت گزارنے سے پہلے رجوع کر  
 لے۔ پھر طلاق دے اور پھر رجوع کر لے اور اس حرکت سے اس کی غرض یہ ہو کہ عورت  
 کو خواہ مخواہ ٹکائے رکھے۔ نہ اپنے گھر میں بسائے اور نہ اسے آزاد ہی کرے کہ بیچاری  
 کہیں اور نکاح کر سکے، تو یہ خدانے قانون سے مسخرہ پن اور کھیل ہے، جس کی جرات  
 کوئی سچا مومن نہیں کر سکتا۔



لغت میں عَوَّل کے معنی میل کے ہیں۔ ابو طالب کا شعر ہے۔

بِمِيزَانٍ صِدْقٍ لَا يَخْسُقُ شَعِيرَةٌ  
وَرُزْزَانٍ قِسْطٍ وَزْنُهُ غَيْرُ عَائِلٍ

یہاں عائل یعنی مائل مستعمل ہوا ہے۔ اسی بنا پر عَوَّل کو جوہر اور طریق عدل سے بہت جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی، عکرمہ اور قتادہ وغیرہم نے لَا تَعْوَلُوا كَمَا كُنْتُمْ تَعْوَلُونَ کے معنی لَا تَسْبِلُوا عَنِ الْحَقِّ كُنْتُمْ تَعْوَلُونَ لہذا قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا اور ایک کی طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے۔ تعدد ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔ قانون کو ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیے اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے داورسی پانے ممانعت ہونا چاہیے۔

عدل کے باب میں قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دلی محبت کا جہان تک تعلق ہے اس میں مساوات برتنے پر نہ انسان تا در ہے اور نہ اس کے لئے مکلف کہ لَنْ يَكُنْ لَكُمْ فَرْقٌ بَيْنَ الذَّكَوٰتِ وَالْاُنثٰى اِنَّ كُنْتُمْ مَوَدِّعِيْنَ اَللّٰمِ الْبَرِّ a

مرد کے ظلم کی تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلقات میں بہت سے ایسے معاملات بھی پیش آسکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں۔ جو مودت و رحمت کے منافی ہیں۔ مگر ان میں

قانون کے لئے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ایسے معاملات کیلئے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ نیا صاف اور محبت آمیز ہونا چاہیے۔ رات دن کی تھکا تھکی جسمتی کے ساتھ زندگی گزارنا محنت ہے۔ اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو۔ نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ ممکن ہی ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے۔ لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ پر معلوم ہوتی ہے کہ عدل و انصاف اور رحمت و مروت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

### مرد کے حقوق :-

مرد کو تو اہمیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اوپر بیان ہوئیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ تو اہم ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

(۱) **حفظ للغیب** عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتا ہے۔

فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَفِظَتْ  
 اَوَّعِيْبَ كَمَا حَفِظَ اللّٰهُ

(النساء - ۶) کی حفاظت کے ماتحت۔

یہاں **حفظ للغیب** سے مراد ہر اُس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو۔ اور اُس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس رہے۔ اُس میں اس کے نسب کی حفاظت ہے اس کے نطفے کی حفاظت، اُس کی آبرو کی حفاظت۔ اس کے مال کی حفاظت

اُس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہو گا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

(۲) شوہر کی اطاعت۔ مرد کا وہ مراحتیہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے **فَالصَّالِحَاتُ قَنِيئَاتٌ (النساء - ۶)** جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً

ان نكمت عليهن ان لا يوطئن  
تہاران پر یہ حق ہے کہ وہ تہارے ہاں  
فرشکمہ احد اتکرھونہ  
کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم  
نا پسند کرتے ہو۔

لَا تَصَدَّقْ بِشَيْءٍ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنْ فَعَلْتَ كَانَ  
لَهُ الْاَجْرُ عَلَيْهَا الْوِزْرُ وَلَا تَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ  
وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے  
اگر ایسا کرے گی تو جو شوہر کو سنے گا اور گناہ عورت پر ہو گا۔ نیز وہ  
اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لَا تَصُومُ الْمَرْأَةُ يَوْمًا وَرَزَقَهَا  
شَاهِدٌ مِنْ غَيْرِ رَمَضَانَ إِلَّا  
بِإِذْنِهِ  
عَوْرَتِ اِسْپَنے شوہر کی موجودگی میں رمضان  
کے سوا افضل روزے اس کی اجازت کے  
بغیر ایک دن بھی نہ رکھے۔  
خَيْرُ النِّسَاءِ امْرَاةٌ اِذَا نَظَرَتْ  
بِہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو



اَلَيْهَا سِرْتِكْ وَاِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ  
وَاِذَا اَهْتَبْتَ عَنْهَا حَفِظْتَ لَكَ فِي  
مَالِكَ وَنَفْسِهَا

دیکھے تو تیرا دل خوش ہو جائے اور جب تو  
اس کو حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے  
اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ  
تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی  
حفاظت کرے۔

اس عام حکم اطاعت میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر  
عورت سے اس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس کا حکم ماننے سے  
انکار کر سکتی ہے بلکہ اسے انکار کر دینا چاہیے۔ مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے  
منع کرے، یا شراب پینے کا حکم دے، یا پردہ شریعی ترک کر لے، یا فواحش کا  
ارتکاب اس سے کرانا چاہے، تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اس کا  
فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے۔ اس لئے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی  
مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ لاطاعة المخلوق في معصية الخالق۔ اس  
صورتِ خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے اگر  
نہ کرے گی تو نافرمان ہوگی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کی  
تفصیل آگے آتی ہے۔

### مرد کے اختیارات :-

تاقانون اسلام نے چونکہ مرد کو توأم بنایا ہے اور اس پر عورت کے جہر، نفقہ  
اور نگہبانی و خبرگیری کی ذمہ داری عائد کی ہے۔ اس لئے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے  
اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے اور اپنے گھر کے اخلاق اور

صن معاشرت کی حفاظت کرنے اور خود اپنے حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانونِ اسلام میں ان اختیارات کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کر دیئے گئے ہیں، جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

انصیحت، تادیب اور تعزیر اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے۔ یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے نہ مانے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسبِ ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے۔ اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

|   |  |
|---|--|
| اور جن عورتوں سے تم نشوز دیکھو ان کو      | وَالَّذِينَ نَحْنَاهُنَّ لَشَوْزَهْنَ    |
| نصیحت کرو۔ اور بستروں پر ان کو چھوڑ       | فَعِطْرُهُنَّ وَ أَهْجُرُوهُنَّ فِي      |
| دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ تمہاری اطاعت    | الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوهُنَّ فَإِنِ     |
| کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا کوئی طریقہ | أَمَّنَكُم مِّنْ أَتْبَعُوْا عَلَيْهِنَّ |
| نہ ڈھونڈو۔                                | سَبِيْلًا (النساء - ۶)                   |

اس آیت میں وَ أَهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) فرما کر مزار کے طور پر ترکِ معاشرت کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر آیتِ ایلاہ

۱۔ نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے، خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

نے، جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، اس کے لئے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے کہ یہ  
 پستری علیحدگی چار مہینے سے زیادہ نہ ہو۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ  
 شوہر ناراض ہو کہ اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت  
 قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکام الہی اس کو طلاق دے دے گا، اور پھر بھی  
 وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے چار مہینے  
 کی مدت ادب سکھانے کے لئے کافی ہے۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا  
 غیر ضروری ہو گا۔ کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا، یہ جانتے ہوئے کہ اس  
 کا نتیجہ طلاق ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں  
 ہے۔ یا وہ حسن معاشرت کے ساتھ کم از کم اس شوہر سے نباہ نہیں کر سکتی۔ نیز  
 اس سے وہ منقاد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لئے ایک مرد کو ایک عورت  
 کے ساتھ رشتہ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسی حالت میں شوہر اپنی  
 خواہشات نفس پوری کرنے کے لئے کسی ناجائز طریقے کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ  
 بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی نقض میں مبتلا ہو جائے یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں  
 میاں بیوی میں سے ایک اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں نزدیکین میں عورت  
 رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

ام سقیان ثوری سے **وَ اَهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ** کے معنی میں ایک دوسرا  
 قول منقول ہے۔ وہ کلام عرب سے استدلال کہہ کے کہتے ہیں کہ **هَجْرٌ** کے معنی  
 باندھنے کے ہیں **هَجْرٌ الْبَعِيْرُ اِذَا رِبَطَهُ صَاحِبُهُ بِالْهَبَارِ**۔ ہجراؤں  
 رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو لاکر باندھی جاتی ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ

کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ کر ڈال دو۔ لیکن یہ معنی قرآن مجید کے منشاء سے بعید ہیں۔ فی الْمُضْطَجِحِ کے الفاظ میں قرآن نے اپنے منشاء کی طرف صاف اشارہ کر دیا ہے مضمیٰ سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور سونے کی جگہ میں باندھنا بالکل بے معنی بات ہے۔

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے۔ مگر اس کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید لگا دی ہے کہ ضرب شدید نہ ہونی چاہیے۔

اضْرِبُوهُنَّ إِذَا عَصَيْنَكُمْ  
فِي الْمَعْرُوفِ ضَرْبًا غَيْرَ مُبْرِحٍ  
وَلَا يَضْرِبُ الْوَجْهَ وَلَا يَقْبِضُ

اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں  
تو ان کو ایسی مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ  
ہو۔ منہ پر نہ مارے اور گال کو کھنچ نہ کرے

یہ دو سزائیں دینے کا مرد کو اختیار دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جاسکتی ہے جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہو۔ نہ یہ کہ ہر جاو بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور عورت نہ مانے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر تصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فَسَنٍ اِغْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اِغْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ۔ جو کوئی تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس تصور پر نصیحت کافی ہے اس پر ترک کلام، اور جس پر ترک کلام کافی ہے اس پر بھڑائی المضاجیح اور جس پر

۱۲۶ | ۱۵۷۱ | ۹۷۲ | ۲ | ۳۸

بھرنی المضاجح کافی ہے اس پر بارنا ظلم میں شمار ہوگا۔ ماریک آخری سزا ہے جو صورت شدید اور ناقابل برداشت تصور پر ہی دی جاسکتی ہے اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کی زیادتی ہوگی اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے امداد طلب کرے۔

(۲) طلاق - دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اس کو طلاق دے دے۔ چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ان حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہوتی تو

لے۔ بعض لوگ اہل مغرب کی تقلید میں یہ چاہتے ہیں کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر سے بچپن کر عدالت کو دے دیا جائے۔ چنانچہ شرک میں ایسا بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ چیز قطعی طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن نے طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے ہر جگہ فعل طلاق کو شوہر کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَإِنْ طَلَّقَهَا۔ وَ اِنْ عَزَّ امْوَالُ الطَّلَاقِ وَغیره۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر کو دیا گیا ہے۔ پھر قرآن صاف الفاظ میں شوہر کے متعلق کہتا ہے کہ۔ یَسِدُّ ۙ عَقْدُ ۙ النِّكَاحِ (البقرہ - ۲۱) نکاح کی گرہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ اب کون یہ حق رکھتا ہے کہ اس گرہ کو اس کے ہاتھ سے بچپن کر قاضی کے ہاتھ میں دے دے۔ ابن ماجہ میں عبد اللہ بن عباس کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور صرف اس وقت اسے چھوڑے گا، جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے فریق کو مل جائے تو اس دوسرے فریق سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس فریق کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

حاشیہ فقیر (۳) شکایت کی کہ میرے اٹانے اپنی لونڈی کا نکاح مجھ سے کیا تھا۔ اب وہ اسے مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اس پر آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا۔ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ مَا بَالُ أَحَدٍ كَهَذَا بَدْرٍ حَبْدٌ أَمْتَهُ ثُمَّ يَرِيدُ أَنْ يَصْرِفَ بَيْنَهُمَا، إِنَّمَا الطَّلَاقُ لِمَنْ اخْتَارَ بِالْبِاقِ**۔ لوگو! یہ کیا جرات ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام سے اپنی لونڈی بیاہ دیتا ہے۔ اور پھر دونوں کو جدا کرنا چاہتا ہے۔ طلاق کا اختیار تو شوہر کو ہے۔ یہ حدیث اگرچہ سند اقویٰ نہیں ہے۔ مگر قرآن کی مطابقت اس کو قوت بخشتی ہے۔ پس قول خدا و سولہ کی بنا پر یہ ہرگز نہ جائز نہیں ہے کہ طلاق دینے کے اختیارات شوہروں سے چھین کر عدالتوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ اور عقلاً بھی یہ بالکل ایک غلط حرکت ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی طرح ہمارے ہاں بھی خانگی زندگیوں کے شرم ناک جھگڑوں اور بدنام واقعات کی برسہا برس عدالت تشہیر ہونے لگے؟

## اصل دوم

اسلامی قانون ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے مگر جب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور رشتہ مناکحت میں ان کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و کراہت اور طبائع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس صورت میں ان کے لئے اور سوسائٹی کے لئے بہتر یہی ہے کہ ان کی علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف وہ رشتہ نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے۔ مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں ہے کہ زوجین کے لئے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے، بہر حال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے۔ مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں کہ ازدواجی تعلق میں میرے سے کوئی پائیداری ہی باقی نہ رہی اور رشتہ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہونے لگا۔

اس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں۔ طلاق،

خلع اور نفا سے قاضی۔

## طلاق اور اس کی شرائط :-

اصطلاح شرعی میں طلاق سے مراد وہ علیحدگی ہے جس کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ مرد اپنے اس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے ان حقوقِ زوجیت سے دست بردار ہو سکتا ہے جن کو اس نے ہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا۔ مگر شریعت طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ **أَبْغَضُ الْحَلَائِلِ إِلَى اللَّهِ تَعَالَى السَّلَاقُ** (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) اور **تَزَوُّجٌ أَوْ لَا تَطْلِقُوا** ان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات (شادیاں کرو اور طلاق نہ دو۔ کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)۔ اس لئے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے، جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارہ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو، تو جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔

وَعَاثِمُ بْنُ مَرْثَدٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: **إِنْ كَرِهَتْ نِكَاحًا فَارْتَحِلْ** (اگر وہ تم کو ناپسند بھی ہوں تو ہر سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔)

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو۔ مگر ایک



لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔ ایک ایک ہینے کے فاصلے سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے ہینے کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے۔ یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش آئند تغیر ہو جائے۔ یا خود تمہارا ہی دل بدل جائے البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیے تو پھر چاہو تو تیسرے ہینے پر آخری طلاق دے دو۔ ورنہ رجوع کئے بغیر کوئی نہی عدت گذر جانے دو۔

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَاَمْسِكْ  
بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْهِ بِاِحْسَانٍ  
(بقرہ - ۲۴)

طلاق دوم مرتبہ ہے، پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا پھر شریعاً نہ طریقہ سے چھوڑ دیا جائے۔  
مُطَلَّقةٌ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک

لے احسن طریقہ یہ ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق نہ دی جائے۔ بلکہ یوں ہی عدت گذر جانے دی جائے۔ اس صورت میں یہ موقع باقی رہتا ہے کہ اگر یہ زوجین باہم نکاح کرنا چاہیں تو دوبارہ ان کا نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن تیسری بار طلاق دینے سے طلاق منقطع ہو جاتی ہے جس کے بعد تحلیل کے بغیر سابق زن و شوہر کا ایک دوسرے سے پھر نکاح نہیں ہو سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ لوگ بالعموم اس مسئلے سے ناواقف ہیں۔ اور جب طلاق دینے پر آتے ہیں تو چھوڑتے ہی تین طلاق دے ڈالتے ہیں۔ بعد میں پچھتاتے ہیں اور مغفیتوں سے چیلے پوچھتے پھرتے ہیں۔

بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوفٍ ..... انتظار میں رکھیں ..... اگر ان کے شوہر  
 وَ لِعَوْلَتِهِنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي إصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس مدت میں  
 ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہوں  
 (بقرہ-۲۸) گئے۔

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین مہینوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے بھیج نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو، ممکن ہے کہ ساتھ رہنے بسنے سے دل مٹنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِوْنِهِنَّ وَ آخِضُوا إِلَيْهِنَّ  
 وَ اتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا  
 يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِعَاقِبَةٍ مُّبِينَةٍ وَ تِلْكَ  
 حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يُتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ  
 لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهُ يُجَدِّثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا فَإِذَا ابْلَغْتُمْ  
 أَسْبَابَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ  
 (الطلاق - ۱)

جب تم عورتوں کو طلاق دو تو زمانہ عدت میں رجوع کی گنجائش رکھنے ہوئے  
 طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں  
 سے نکال نہ دو۔ اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی بگاری  
 کی ترکیب ہوتی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز  
 کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ سچھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد

کوئی (اصلاح کی) صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ مدت مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں۔ تو یا ان کو بھلے طریقے سے روک لویا بھلے طریقے سے جدا ہو جاؤ۔

پھر حالتِ حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو ظہر کی حالت میں دو۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ حیض کی حالت میں عموماً عورتیں چڑچڑی اور بد مزاج ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے جسمانی نظام میں کچھ ایسا تغیر واقع ہو جاتا ہے کہ بلا ارادہ ان سے وہ باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں، جنہیں عام حالت میں وہ خود پسند نہیں کرتیں۔ یہ ایک طبعی حقیقت ہے۔ اس لئے زمانہ حیض میں میاں اور بیوی میں جو نزاع واقع ہو جائے اس پر طلاق دینے سے منع کر دیا گیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں زوجین کے درمیان وہ جسمانی تعلق نہیں ہوتا جو ان کی باہمی دل چسپی و چسپیدگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس زمانے میں دونوں کے درمیان بد مزگی پیدا ہو جانا بعید نہیں ہے۔ یہ رکاوٹ دور ہو جانے کے بعد توقع کی جاسکتی ہے کہ شاید جذباتِ لطیف زوجین کو پھر باہم متیر و شکر کر دیں اور وہ غبار دور ہو جائے جو شوہر کو طلاق کی طرف مائل کر رہا تھا۔

انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبد اللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانہ میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپؐ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دے دو کہ رجوع کرے

اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اس نفل پر تو بیخ فرمائی اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی۔

• ابن عمر تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرو۔ پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ دوسری مرتبہ طہر ہو تو اس وقت یا طلاق دے دو یا اس کو روک لو۔  
حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا۔

يَا رَسُولَ اللَّهِ أَدْعَيْنِكَ لَوْ كُنْتَ طَلَقْتَهَا ثَلَاثًا أَكَانَ لِي أَنْ أَرَا جَعَلَهَا  
• اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا؟  
حضور نے فرمایا :-

لَا كَانَتْ تَبَيِّنٌ وَتَكُونُ مَعْصِيَةً --  
”نہیں، وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا۔“

اس سے ایک اور بات معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے۔ دراصل یہ نفل شریعہ اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے۔ اور اس سے اللہ کی وہ حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام کا سورہ طلاق میں سخت تاکید کی گئی ہے۔ حضرت

لے۔ جیسا کہ ابھی فقہ حنفی دیر پہلے ہم بیان کر چکے ہیں ہ شریعت کا منشا تو یہ ہے کہ ہوا زواجی تعلق ایک مرتبہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان قائم ہو گیا اسے حتی الامکان برقرار رکھا جائے۔ اور اگر توڑا بھی جائے تو اس وقت جب کہ نباہ اور مصالحت کے تمام امکانات

عمر ابن خطاب کے متعلق منقول ہے کہ جو شخص مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا ان کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جُدا کر دیتے۔

حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

آپ نے فرمایا:۔

إِنَّهُ قَدْ عَطَىٰ رَبَّهُ رِبًّا نَّتْ (مِرَاتِنَهُ)

”اُس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی عورت اس سے جُدا ہو گئی۔“

حضرت علی رضی فرماتے ہیں:۔

لَوْ أَنَّ النَّاسَ أَصَابُوا أَحَدَ الطَّلَاقِ مَا نَدَّ أَحَدٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ  
”اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے، تو کسی شخص کو

اپنی بیوی کے جُدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔“

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت روکاؤٹ

(بقیہ صفحہ ۵۵) ختم ہو چکے ہوں۔ اس بنا پر شریعت چاہتی ہے کہ جو شخص بھی طلاق

دے خوب سوتج سمجھ کر دے اور طلاق دینے پر بھی صلح صفائی کا دروازہ تین ہیبتیں تک

کھلا رہے۔ مگر جو شخص بیک وقت تین طلاق دیتا ہے۔ وہ ان تمام مصلحتوں کو ایک ہی

دار میں کاٹ پھینکتا ہے۔

یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاقِ منغلظہ دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا تاؤتقیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اور وہ دوسرا مرد اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برضا و رغبت اسے طلاق نہ دے۔

بَانَ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ  
بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرًا۔  
پھر اگر وہ اس کو تیسری بار طلاق دے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہو  
سکتی جب تک وہ ایک دوسرے مرد سے  
نکاح نہ کر لے۔ (لقبرہ - ۲۹)

یہ ایک ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو تیسری طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا، جب تک وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کر لے کہ اسے اس عورت کے ساتھ نباہ کرنا ہی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لئے یہ حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت کو تین بار طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کر دے اور پھر کچھ دے دلا کر اس کو خلوت سے پہلے طلاق دلوادے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح فرمادی ہے کہ تحلیل کے لئے محض نکاح تہذیب کا کافی نہیں ہے بلکہ عورت اس وقت

۱۔ یعنی تین طلاق جن کے بعد عورت دوبارہ اس شوہر کے نکاح میں نہیں آسکتی۔ تاؤتقیکہ اس کا نکاح کسی اور شخص سے ہو کر فرقت واقع نہ ہو جائے۔

تک پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے طعت صحبت حاصل نہ کرے۔

لَا تَحِلُّ لَكَ زَوْجُهَا الْأَوَّلُ حَتَّى يَذُوقَ الْآخَرَ عَسَيْتَ لَهَا وَتَذُوقَ عَسَيْتَ -

پھر جو شخص محض اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرے۔ اور جو اس غرض سے نکاح کرے ان دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُحَلَّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ اور ایسے شخص کو آپ تیس مُسْتَنْعَاذ کر کے کے ساتھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ فی الواقع اس طرح کے نکاح اور نہائیں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت اُن علماء پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک جیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔

فصل :-

شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں کر سکتا اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو اس سے نخلع کرے۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اخلاقی ہے اور دوسرا قانونی۔

اخلاقی پہلو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو طلاق یا نخلع کا اختیار

صرت ایک آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لئے طلاق اور خلع کو کھیل بنا لیا جائے۔ چنانچہ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات منقول ہیں کہ۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِينَ وَالذَّوَّاقَاتِ  
اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔

لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى كُلِّ ذَوَّاقٍ مِطْلَاقٍ -  
ہر طالب لذت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت کی ہے۔

جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے اس کی کسی زیادتی کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہوگی۔ خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں۔

أَيْسًا امْرَأَةٌ اخْتَلَعَتْ مِنْ زَوْجِهَا بِغَيْرِ نُسْرَةٍ فَعَلَيْهَا لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ الْمُتَنَفِّعَاتِ -

لیکن قانون جس کا کام انخاص کے حقوق متعین کرنا ہے، اس پہلو سے بحث نہیں کرتا، وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لئے بروقت ضرورت عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو، اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کر دیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتہ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لئے بندھے ہوئے ہیں کہ اس گرفت سے آزاد



ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حقوق کو بیجا طور پر استعمال کرے گا۔ تو اس بارے میں قانون جہاں تک ممکن اور مقبول ہے پابندیاں عاید کرتا ہے۔ مگر حق کے بجایا بے جا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیارِ تمیزی اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے۔ اس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ محض طالبِ لبت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائزہ حاجت رکھتا ہے۔ قانون اس کا فطری حق اسے دینے کے بعد اس کو بے جا استعمال سے روکنے کے لئے صرف ضروری پابندیاں اس پر عائد کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیحدگی کا حق دینے کے ساتھ اس پر متعدد قیود لگا دی گئی ہیں مثلاً یہ کہ جوہر اس نے عورت کو دیا تھا، اس کا نقصان گوارا کرے، زمانہ حیض میں طلاق نہ دے۔ تین طہروں میں ایک ایک طلاق دے۔ عورت کو زمانہ عدت میں اپنے ساتھ رکھے۔ اور جب تین طلاق دے چکے تو پھر وہ عورت تبدیل کے بغیر دوبارہ اس کے نکاح میں نہ آسکے۔ اسی طرح عورت کو بھی طلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ جن کو قرآن مجید اس مختصر سی آیت میں تمام کمال بیان کر دیتا ہے۔

وَلَا يَجِلُّ لَكُمُ أَنْ تَأْخُذُوا بِمَا آتَيْتُمُوهُنَّ مِنْ شَيْءٍ  
إِلَّا أَنْ يُخَانَا إِلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ  
إِلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ

۵۹ (بقرہ - ۲۹)

تہا سے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو۔ اس میں سے کچھ بھی واپس لو۔ الا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کہ عقد نکاح سے آزاد ہو جائے۔

اس آیت سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) خلع ایسی حالت میں ہونا چاہیے۔ جب کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔ **فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ** کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خلع ایک بُری چیز ہے، جس طرح کہ طلاق بری چیز ہے، لیکن جب یہ خوف ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خلع لینے میں کوئی برائی نہیں۔

(۲) جب عورت عقد نکاح سے آزاد ہونا چاہے، تو وہ بھی اسی طرح مال کی قربانی گوارا کرے جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اگر خود طلاق دے تو وہ اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو اس نے عورت کو دیا تھا اور اگر عورت جدائی کی خواہش کرے تو وہ اس مال کا ایک حصہ یا پورا مال واپس کر کے جدا ہو سکتی ہے، جو اس نے شوہر سے لیا تھا۔

(۳) افتداء (یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لئے محض نذیرہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں ہے بلکہ اس معاملہ کا تمام اس وقت ہونا ہے جب کہ نذیرہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک

مقدار مال پیش کر کے آپ سے آپ علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ علیحدگی کے لئے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے اس کو شوہر قبول کر کے طلاق دے دے۔

(۴) خلع کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اس کا ایک حصہ پیش کر کے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کر کے طلاق دے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ کے الفاظ پر عمل کرتے ہیں کہ خلع کا فعل طرفین کی رضا مندی سے مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خلع کے لئے عدالتی فیصلے کو شرط قرار دیتے ہیں۔ جو معاملہ گھر کے اندر طے ہو سکتا ہے۔ اسلام اسے عدالت میں لے جانا ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(۵) اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں عورت کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يَفِي بِمَا حُدَّ وَدَّ اللَّهُ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس آیت میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اولی الامر ہی کی طرف ہے چونکہ اولی الامر کا اولین فرض تو حدود اللہ کی حفاظت ہے، اس لئے ان پر لازم ہو گا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوا دیں جو انہی حدود کے تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے۔

یہ عمل احکام ہیں جن میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف کن صورتوں میں متحقق ہو گا؛ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف

کیا ہے؟ اور اگر عورت افتدایہ پر آمادہ ہو، لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں تاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مقدمات کی رودادوں میں ملتی ہیں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے سامنے پیش ہوئے تھے۔

### صدرِ اول کے نظائر درباب خلع

خلع کا سب سے مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے ان کی بیویوں نے خلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمہ کی تفصیلات کے مختلف ٹکڑے احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن کو ملاحظہ کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت ابی بن سلول (عبد اللہ ابن ابی کی بہن) کا قصہ یہ ہے کہ انہیں ثابت کی صورت ناپسند تھی۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خلع کے لئے مرافعہ کیا اور ان الفاظ میں اپنی شکایت پیش کی۔

يَا رَسُولَ اللَّهِ لَا يَجْمَعُ رَأْسِي وَرَأْسَهُ شَيْءٌ أَبَدًا  
انِي رَفَعْتُ جَانِبَ الْخَبَاءِ فَرَأَيْتَهُ أَقْبَلَ فِي عِدَّةٍ فَإِذَا  
هُوَ أَشَدُّ هَمًّا سِوَاكَ وَأَقْصَرُ هَمًّا تَامَةً وَأَقْبَحُهُمْ  
وَجْهًا۔ (ابن خیر)۔

بعض نے زینب بنت عبد اللہ بن ابی کہا، مگر مشہور یہی ہے کہ ان کا نام جمیلہ تھا۔ اور عبد اللہ ابن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

یا رسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع نہیں کر سکتی۔  
میں نے اپنا گھونگھٹ جواٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کیساتھ  
اگر ہاتھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان سب زیادہ کالا اور سب زیادہ  
پستہ قد اور سب سے زیادہ بد شکل تھا۔

وَاللّٰهُ مَا كَرِهَتْ مِنْهُ  
دِيْنَا وَلَا خَلْقًا إِلَّا إِنِّي كَرِهَتْ  
وَمَا تَه (ابن جریر)  
وَاللّٰهُ لَوْلَا مَخَانَةٌ لِّلّٰهِ  
إِذَا رَجُلٌ عَلَىٰ بَصْمَتٍ فِي  
وَجْهِهِ (ابن جریر)

خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی  
کے سبب سے اس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ  
مجھے اس کی بد صورتی ناپسند ہے۔  
خدا کی قسم اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جب وہ  
میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت میں اس  
کے منہ پر ٹھوک دیتی۔

يَا رَسُولَ اللّٰهِ جِي مِنْ  
الْجِبَالِ مَا تَرَىٰ وَثَابِتِ رَجُلٍ  
رَمِيْمٍ (عبدالرزاق بجوالہ فتح الباری)  
وَمَا اَحْتَبَ عَلَيْهِ فِي نَلَقٍ  
وَلَا دِيْنٍ وَلَكِنِّي اَكْرَهُ الْكُفْرَ فِي  
الاسلام (بخاری)

یا رسول اللہ میں جیسی خوبصورت ہوں آپ  
دیکھتے ہیں اور ثابت ایک بد صورت شخص  
ہے۔  
میں اس کے دین اور اخلاق پر کوئی حزن نہیں  
رکھتی۔ مگر مجھے اسلام میں کفر کا خوف  
ہے۔ لہٰذا

لہٰذا اسلام میں کفر کے خوف سے مراد یہ ہے کہ کراہت و نفرت کے باوجود اگر میں اس کیساتھ  
رہتی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان احکام کی پابند نہ رہ سکوں گی، جو شوہر کی اطاعت اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی اور فرمایا کہ اتدین علیہ حدیقتہ  
 التی اعطایہ؛ جو باغ تجھ کو اس نے دیا تھا وہ تو واپس کر دے گی؟ انہوں  
 نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ، بلکہ وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضور نے  
 فرمایا۔ انا السزیدۃ فلا دکن حدیقتہ۔ زیادہ تو نہیں مگر تو اس کا باغ  
 واپس کر دے۔ پھر ثابت کو حکم دیا کہ۔ اقبل الحدیقتہ وطلقها تطلیقتہ  
 باغ قبول کر لے اور اس کو ایک طلاق دیدے۔

ثابت کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں۔ جن کا واقعہ امام  
 مالک اور ابو داؤد نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضور اپنے  
 مکان سے باہر نکلے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔ دریافت فرمایا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے  
 عرض کیا۔ لا انا ولا ثابت بن قیس۔ میری اور ثابت کی نبہ نہیں سکتی۔  
 جب ثابت حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے، اس نے بیان  
 کیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہ نے عرض کیا یا رسول اللہ جو کچھ

(فقیر حاشیہ ص ۶۴) اس کی وفاداری اور عظمت و عظمت کے تحفظ کے لئے اللہ اور رسول نے  
 دیئے ہیں۔ یہ ایک مومنہ کا قصور ہے کہ حقوق اللہ کے توڑنے کو وہ کفر سمجھتی ہے۔ اور  
 کج لال کے موربوں کا قصور یہ ہے کہ اگر ناز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ بھی ادا نہ کیا جائے اور  
 کلمہ کھلافتی و حور کا ارتکاب کیا جائے۔ تب بھی وہ اس حالت کو ایک ایمانی حالت  
 کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور جو اسے  
 غیر ایمانی حالت کہے اسے خارجی ٹھہراتے ہیں۔

ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے۔ حضور نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ لے لے اور اس کو چھوڑ دے بعض روایتوں میں نَحْلٍ سَبِيكًا کے الفاظ ہیں اور بعض میں قَارِقَهَا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابو داؤد اور ابن جریر نے حضرت عائشہ سے اس واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ ثابت نے حبیبہ کو اتنا مارا تھا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حبیبہ نے آکر حضور سے شکایت کی آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ خذ بعض مالها و قارِقها، اس کے مال کا ایک حصہ لے لے اور جدا ہو جا۔

مگر ابن ماجہ نے حبیبہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو بھی ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ مار پیٹ کی نہیں بلکہ بد صورتی کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وہی الفاظ کہے جو دوسری احادیث میں حبیلہ سے منقول ہیں، یعنی اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دن قید رکھنے کے بعد آپ نے اسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو انہی راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اِخْلَعْهَا بِحِجَّتِ رِئُوسِ قَدْرَطِهَا۔ اس کو خلع دے دے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں

کے عوض ہی میں ہو۔

ربیع ہفت مہینہ عفرار نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا۔ شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمانؓ کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا موہا تک لے لے اور اس کو خلع دے دے۔ فاجازہ راصد۴ باخذ عقاس رأسہا فنادونہ <sup>۱</sup> احکام خلع ۱۔

ان روایات سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔  
 ۱، فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يَفِي بِمَا حَدَّثَكُمْ اللَّهُ كِ تفسیر وہ شکایات ہیں جو ثابت بن قیس کی بیویوں سے منقول ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کی اس شکایت کو خلع کے لئے کافی سمجھا کہ ان کا شوہر بد صورت ہے۔ اور وہ ان کو پسند نہیں ہے۔ آپ نے ان کو خوبصورتی کے فلسفے پر کوئی لکچر نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ ان عورتوں کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت و کراہت بیٹھ چکی ہے تو آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا۔ کیونکہ نفرت و کراہت کے ساتھ ایک عورت اور مرد کو جبراً ایک دوسرے سے باندھ رکھنے کے نتائج دین اور اخلاق اور تمدن کے لئے طلاق و خلع سے زیادہ خواہ ہیں۔ ان سے تو مقاصد شریعت ہی کے فوت ہو جانے کا خوف ہے پس نبی

لہ کشف الغمہ ج ۲۔

علامہ عبد الرزاق بحوالہ فتح الباری



سلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ تادمہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا تحقیق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو قطعاً ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے فعل سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نفرت و کراہت کی تحقیق کے لئے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے۔ تاکہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس جوڑے میں اب نباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

(۳) حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ ایک معقول بات ہے عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سننے والا نفرت کے لئے کافی نہ سمجھے گا۔ لیکن جس کو ان اسباب سے رات دن سابقہ پیش آتا ہے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لئے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہذا قاضی کا کام صرف اس واقعہ کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اس کا کام نہیں ہے کہ جو وجوہ عورت بیان کر رہی ہے وہ نفرت کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔

(۴) قاضی عورت کو دو عطف و بند کر کے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خلع اس کا حق ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے۔ اور اگر وہ اس امر کا

اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑ دے مگر اس خاص مرد کے ساتھ بہر حال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

(۵) خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی کے لئے متفرج طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالبِ خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدماتِ خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اول تو اس سوال کی کا حقہ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اُس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذوقِ ایت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حقِ طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوقِ ایت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے۔ عورت کے حقِ خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ بنایا جائے تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالبِ خلع عورت دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ یا وہ فی الحقیقت خلع کی جائز ضرورت رکھتی ہوگی۔ یا محض ذوقِ ایت ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اس کے مطالبہ کو رد کرنا ظلم ہوگا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کو خلع نہ دلوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ جو عورت طبعاً ذوقِ ایت ہوگی وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے رہے گی۔ اگر آپ اس کو جائز طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں سے

اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ بُرا ہوگا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے نکاح میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

(۶) اگر عورت خلع مانگے اور اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اس کو حکم دے

گا کہ اسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔ اور قاضی کا حکم بہر حال یہی معنی رکھتا ہے۔ کہ محکوم علیہ اس کے بجالانے کا پابند ہے۔ جتنی کہ اگر وہ بجانہ لائے تو قاضی اس کو قید کر سکتا ہے۔ شریعت میں قاضی کی حیثیت صرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اس کا حکم مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔ قاضی کی اگر یہ حیثیت ہو تو لوگوں کے لئے اس کی عدالت کا دروازہ کھلا ہونا محض بے معنی ہے۔

(۷) خلع کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ایک طلاق بائن

کا ہے یعنی اس کے بعد زمانہ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ کیونکہ حق رجوع بائن رہنے سے خلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ عورت نے جو مال اس کو دیا ہے وہ عقد نکاح سے اپنی رہائی کے معاوضہ میں دیا ہے، اس لئے اگر شوہر معاوضہ لے لے اور اس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہوگی جس کو شریعت جانتی نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طلاق مغلظہ نہیں ہے۔ جس کے بعد دوبارہ نکاح

کرنے کے لئے تحلیل شرط ہو۔

(۸) خلع کے معاوضہ کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جیسے معاوضہ پر بھی زوجین راضی ہو جائیں اس پر خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دینے ہوئے مہر سے زیادہ مال لے۔ آپ کا ارشاد ہے۔ لَا يَأْخُذُ الرَّجُلُ مِنَ الْمُخْتَلَعَةِ أَكْثَرَ مِمَّا أُعْطَاهَا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی بالفاظ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ آئمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لئے سرے سے مال ہی لینا مکروہ ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے وَان كَانَ النِّسْوَانُ مِنْ قَبْلِهَا يَكْرَهُ لَهَا أَنْ يَأْخُذَ مِنْهَا عَوَضًا۔ ان تصریحات کو دیکھتے ہوئے اس باب میں اصولِ شرع کے ماتحت یہ ضابطہ بنایا جاسکتا ہے کہ اگر خلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوونما ثابت کر دے، یا خلع کے لئے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں تو اس کو مہر کے ایک تلییل جز یا نصہت کی واپسی پر خلع دلایا جائے۔ اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوونما ثابت کرے نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اس کے لئے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے رویے میں قاضی کو ذواقیت کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اس کو مہر سے زیادہ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی

خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانونِ اسلامی میں عورت

اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا۔ اور اصولِ شرع کے خلاف، خلع دینے یا نہ دینے کو بالکل مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوتیں اور ہورہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں۔ بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے۔

عورت سے خلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے، وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خلع کا معاملہ کلیتہً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدود اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع دینا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو گیا ہے۔ اگر عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شہرت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ معاملہ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دوسرے فریق کے ہاتھ میں دے دے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کئے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلامی شریعت میں متوازن ازدواج کی بناء ہی اس اصل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکیزگی اخلاق اور مردت و رحمت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اس کا استحکام

مستحق اور ضروری ہے اور اس کو توڑنا یا تڑوانے کی کوشش کرنا سخت نامحود ہے اور جب یہ تعلق دونوں کے لئے، یا دونوں میں سے کسی ایک کے لئے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے۔ یا اس میں عورت و رحمت کی جگہ نفرت و کراہت داخل ہو جائے، تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے اور اس کا باقی رہنا اغراض شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے ماتحت شریعت نے معاملہ نکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقد نکاح کے ناقابل برداشت ہو جانے کی صورت میں حل و عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلہ کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی آلہ کا نام خلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے، کہ جب وہ عقدہ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اس کا مطالبہ کرے، اور اگر مرد اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دے تو پھر قاضی سے مدد لے۔

زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، اور خدا اور رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا۔ مگر قاضی کے اختیار سماعت کو درمیان سے خارج کر کے یہ توازن بگاڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا، اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ اگر مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ اسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے

تو اس کے پاس اس تعلق کو قطع کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاوقتیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کر دے وہ مجبور ہے کہ بہر حال اس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لئے محال ہی کیوں نہ ہو جائے اور ناکحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں۔ کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوتی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟ یہ جسارت اگر کوئی کرے تو اسے احوال فقہاء سے نہیں بلکہ کتاب و سنت سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول نے خلع کے معاملہ میں قاضی کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔

### مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات :-

قرآن مجید کی جس آیت میں خلع کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ اس کو پھر پڑھیے

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يَاقِبَا أَحَدًا ۖ وَاللَّهُ فَلاَ يُغْنِي عَنْهُمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔

اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ان دونوں (یعنی زوجین) پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ (یعنی عورت) کچھ فدیہ دے کہ علیحدگی حاصل کر لے۔ (بقرہ - ۲۹)

اس آیت میں خود زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں میں کیا گیا ہے لہذا لفظ خِفْتُمْ (اگر تم کو خوف ہو) کے مخاطب وہ نہیں ہو سکتے۔ اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکم الہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر خود میں باہمی رضامندی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کیا جائے اس کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پاس خلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں خلع پر راضی نامہ نہ ہو سکے، تو عورت کو تاقضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب اگر فی الواقع تاقضی اس معاملہ میں صرف سماعت کا اختیار رکھتا ہو، مگر مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں اس سے اپنا فیصلہ منوانے کا اقتدار نہ رکھتا ہو۔ تو تاقضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہو گا۔ کیونکہ اس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ تاقضی اس معاملہ میں بے اختیار ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جتنے فیصلے اور پر منقول ہوئے ہیں۔ ان سب میں یا تو صیغہ امر آیا ہے جیسے **طَلَّقَهَا** (اسے طلاق دے)، **فَارِقَهَا** (اس سے جدا ہو جا) اور **خَلِّ سَبِيلَهَا** (اس کو چھوڑ دے) یا یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ اور ابن جریر نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ **فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا** پھر آپ نے ان کو جد کر دیا۔ اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی ہیں جو خود جلیلہ بنت ابی بن سلول سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ تاقضی خلع کے معاملہ میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اگر شوہر اس حکم کو محض مشورہ سمجھ کر ملنے سے انکار کرے تو کیا تاقضی اس سے جبراً اپنا حکم منوا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں تو ایسی کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی۔



کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے سرتابی کی جرأت کی ہو۔  
 لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں، جس میں آپ  
 نے ایک ہیکٹر شوہر سے فرمایا تھا۔ لَسْتُ بِبَارِعٍ حَتَّى تَرْضَى بِبِئْتَلِ  
 حَارِصِيَّتِ يَهْ يَعْنِي تَجْتَنِي نَهْ چھوڑا جائے گا۔ جب تک کہ تو بھی اسی طرح حکمین  
 کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔ اگر تاضی  
 ایک شوہر کو حکمین کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار پر حراست میں رکھ سکتا ہے تو  
 وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لئے تو بدرجہ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا  
 ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام معاملات میں سے صرف ایک خلع ہی کا  
 مسئلہ ایسا ہو جسے تاضی کے اس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں  
 میں متعدد جزئیات ایسے ملتے ہیں جن میں تاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر  
 اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو تاضی خود تفریق کر دے۔ پھر کیوں نہ خلع کے  
 مسئلہ میں بھی تاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

آگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے ان سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ  
 واضح ہو جائے گی کہ عینین اور محبوب اور خصی اور جذامی اور مبروص اور مخبون  
 شوہروں کے مسئلہ میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کئے ہیں، اور اسی طرح  
 خیبار بوغ اور بعض دوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کئے گئے ہیں،  
 ان کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو خلع دلانے کے

۱۰ نامرد ۱۰ مفلوح الذکر ۱۰ کوڑھی

پورے اختیارات قاضی کو حاصل ہوں۔ ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں، ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں رہتی کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں، یا خودکشی کر لیں۔ یا اپنے داعیاتِ نفس سے مجبور ہو کر فواحش میں مبتلا ہو جائیں، یا مجبوراً مرتد ہو کر قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو فیضِ مدعا کے لئے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عینین کے معاملہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہم بستری پر قادر ہو گیا۔ حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اس نے ادھوری مباشرت بھی کر لی تھے تو عورت کو فریجِ نکاح کا حق نہیں ہے۔ بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لئے باطل ہو گیا۔ اگر عورت کو نکاح کے وقت معلوم تھا کہ وہ نامرد ہے اور پھر وہ نکاح پر راضی ہوئی تو اس کو سروسے سے قاضی کے پاس دعویٰ ہی لے جانے کا حق نہیں ہے۔ اگر اس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر نامرد ہو گیا تب بھی عورت کو دعویٰ کا حق نہیں ہے۔ اگر عورت کو

لہ فی رد المختار عن المعراج اذا ارجع الحشفة فقط فليس بعینین وان كان

مقطوعاً فلا بد من ایلاج بقیة الذکر

لہ فی العنکبوتیة ان علمت المرأة وقت النکاح انه عینین لایصل

ال النساء لایكون لها حق الخصومة

لہ فی الدر المختار نلو جب بعد وصوله الیہا منہ اوصار عینینا بعدہ

الی الوصول لایضرق لحصول حقها بالوطی ورجة

نکاح کے بعد شوہر کے نام نہ ہونے کا علم حاصل ہو اور وہ اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے تب بھی وہ ہمیشہ کے لئے خیار فسخ سے محروم ہو گئی۔ ان صورتوں میں عورت کا خیار فسخ تو یوں باطل ہو گیا۔ اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خلع کر لے مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا۔ کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا مہر بلکہ مہر سے کچھ زیادہ لے کر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا، اور عدالت سے رجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کر کے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کر دیتی ہے اب غور کیجئے کہ اس غریب عورت کا حشر کیا ہو گا؟ بس یہی ناکہ یا تو وہ خود کشی کر لے، یا عیسائی راہبیت کی طرح نفس کشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر روح فرسا تکلیفیں برداشت کرے۔ یا قید نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مبتلا ہو۔ یا پھر سرے سے دینِ اسلام ہی کو خیر باد کہہ دے۔ مگر کیا اسلامی قانون کا منشاء بھی یہی ہے کہ عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے قانون ازدواج بنایا گیا تھا؟ کیا ایسے زوجین میں مودت و رحمت ہوگی؟ کیا وہ باہم مل کر تمدن کی کوئی مفید خدمت کر سکیں گے؟ کیا ان کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہو سکیں گے؟ کیا یہ قید نکاح کسی حیثیت سے بھی احسان کی تعریف میں آسکے گی اور اس سے دین اور اخلاق اور عفت کا

لے قال الشامی قولہ لم یبطل ای ما لم تقل رضیت بالمقام معہ

تلفظ ہوگا؟ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا  
 بھوراً اس کے فواحش میں مبتلا ہونے، یا دائرہ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے  
 سر ہوگا؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے قانون میں  
 ایسا کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔

قصائے شرعی :-

طلاق اور خلع کی بحث میں قانون اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں،  
 ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدہ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ  
 عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور رزق و  
 رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے  
 تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تشریح باحسان  
 ہونا چاہیے۔ یعنی جو میاں بیوی سیدھی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی  
 طرح الگ ہو جائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلافات سے  
 نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو۔ بلکہ خاندانوں میں نیتے برپا ہوں، سوسائٹی میں  
 گندگی پھیلے، اخلاقی مفسد کی اشاعت ہو۔ اور آئندہ نسلوں تک ان کے  
 بُرے اثرات متعدی ہو جائیں۔ انہی خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے  
 شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ تاکہ اگر وہ چاہیں  
 تو خود تشریح باحسان کے اصول پر عمل کر سکیں۔ لیکن بہت سی ایسی جھگڑاؤں

ہے۔ یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اسلامی شریعت میاں اور بیوی کے باہمی

طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ اسماک بالمعروف پر عمل کر سکتی ہیں اور نہ تشریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں، نیز ادراجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے، یا اسماک بالمعروف اور تشریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیے اور حقوق اللہ کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیا ہے جس کا نام قضاء شرعی ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۷۹) جھگڑوں کا پہلک میں علانیہ برسر عدالت آنا پسند نہیں کرتی۔ اس لئے اس نے عورت اور مرد دونوں کیلئے ایسے قانونی چارے کار رکھ دیئے ہیں کہ حتی الامکان گھر کے گھر ہی میں وہ اپنے جھگڑے نکالیں۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا بالکل آخری تدبیر ہے۔ جب کہ گھر میں فیصلہ کر لینے کا کوئی امکان نہ ہو۔

# قضاء شرعی کے متعلق چند اصولی مباحث

قبل اس کے کہ اُن مسائل کو بیان کیا جائے جو قضاء شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی توضیح ضروری ہے۔  
 قضاء کے لئے اولین شرط :-

قضاء شرعی کی شرائط میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ عدالت لازماً اسلامی عدالت ہونی چاہیے اور قاضی کو لازماً مسلمان ہونا چاہیے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہاء نے بتصریح بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اصولی شرع کے تحت شرعی معاملات میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک غیر مسلم حکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکام شرعی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہو گا اور نہ شرعاً عورت کے لئے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہو گا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہو گا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی۔ رہی دوسری وجہ تو وہ یہ ہے کہ قرآن غیر اسلامی عدالت کے فیصلہ کو اولیٰ تو اصولاً تسلیم ہی نہیں کرتا۔ پھر مسلمانوں کے معاملہ میں خصوصاً اس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ان پر عدالت کفر کا حکم اللہ کے نزدیک مستم نہیں ہے

اس مسئلہ کی پوری توضیح میں اپنے مضمون "ایک نہایت اہم استفسار" میں کہ چکا ہوں، جو اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ لگا دیا گیا ہے۔  
قضائے کے لئے اجتہاد کی ضرورت :-

علاوہ بریں جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے، اگرچہ ان کے لئے شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں، لیکن شخصی معاملات میں ہر ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تفسیر، اور اصولی قانون سے حسبِ موقع جزئیات کا استنباط اور روحِ قانون کے مطابق فصلِ خصومات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوتِ اجتہاد ہو اور اس کے ساتھ اس کے دل میں اعتقاد اُس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لئے وہ منصبِ قضا پر مامور ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہباً مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حاوی ہو، اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس کے اصل ماخذ پر دست رس رکھتا ہو اور مسلم سوسائٹی کے نظامِ ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی معاملات کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضا شرعی نہ ہونے کے نقصانات لے

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک

لے یہاں پھر اس امر کی توضیح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اصولاً اس قضا شرعی (باقی صفحہ پر)

مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد منصب قضاہ منسوخ کر دیا گیا اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیئے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصولی ثلثت کے مطابق جس چیز پر قضائے شرعی کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکلہ مقفود ہو گئی۔ اور مسلمانوں کے لئے اپنے شرعی معاملات میں عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا ناممکن ہو گیا۔ جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جاسکتا ہو۔ جو دوسرا نقصان جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہوا کہ ان عدالتوں کے حکام کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے قانونِ اسلامی کے اصول و فروع پر انہی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوتِ اجتہاد پیدا ہو جائے اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تامل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے۔ مثلاً ہاملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے

دقیقہ (۲) کی صحت کا معتقد نہیں ہوں جو غیر اسلامی حکومت کے اذن سے قائم ہوگا۔ اس جگہ برسمیل تشریحی وہ صورت بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے اسلامی حکومت قائم ہونے تک ہندوستانی مسلمانوں کے شرعی معاملات بدرجہہ آخوند صحت ہو سکتے ہیں۔



اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور بیلی (Baillie) جس کا ڈائجسٹ آف محمدن لا (Digest of Muhammadan Law) فتاویٰ عالمگیری کے

اقتباسات کے ترجمہ سے ماخوذ ہے اور مکیناٹن (Macnaughton)

جس کی کتاب پرنسپلز آف محمدن لا (Principles of Muhammadan

Law) ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی

ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرہ معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں چنانچہ جسٹس مارکبی ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے۔

”شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ

اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے

مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی

آمادہ ہوں۔“

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے

کی جرات کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا

کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے اور نہ حکومت منسلطہ

کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس

قانون کے حدود سے تجاوز نہ کر سکیں۔ ایک مقدمہ کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارتھ

”خواجہ حسین بنام شہزادی بیگم۔“ لے ملک عبدالغفور بنام ملیگا۔

نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔

”قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے، اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں، جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں، حتیٰ الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اول تو یہ بھی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں تطبیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آتے ہیں۔ اس لئے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جس پر کوئی حکم مبنی ہو اور پھر قواعد انشاء نیک بنی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے۔“

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف ہے اور اختلافات ائمہ میں تطبیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا۔ وہ اسلامی قوانین میں اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علانیہ جان بوجھ کر ٹھہراتا ہے اور اسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر

کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا ایمان و علم کا نتیجہ ہے کہ جو ادھورا اور ناقص قانون محمدؐن لار کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے، اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

### اصلاح کی راہ میں پہلا قدم:-

پس معاملاتِ نکاح و طلاق اور دوسرے شرعی معاملات میں صحیح فیصلے حاصل کرنے کی کم سے کم اگر کوئی صورت اس وقت ممکن ہے تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک میں تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) حاصل ہو اور اس کے تحت مسلمان اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے خود اپنے محاکم شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں۔ اور ان محکموں میں ایسے منقحی علماء قاضی کی حیثیت سے مقرر کئے جائیں جو قانونِ شریعت میں فقیہانہ بصیرت رکھتے ہوں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر حقیقت میں مسلمان کے لئے مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہاں زندگی بسر کرنا محال ہے۔ اور اگر یہ چیز بھی انہیں

لے اس مسئلہ پر مفصل بحث میں نے اپنی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم میں کی ہے۔

www.KitaboSunnat.com  
۸۷

حاصل نہ ہو تو برسبیل تنزل اتنا ہی سہی، اور یہ انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہے کہ مذہب الہی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جہی میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر اس سے یہ منوایا جائے کہ مسلمانوں کے معاملات نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچایت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی۔ اور انگریزی عدالتوں میں ان کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی۔ اور خود انگریزی عدالتوں میں جو مقدمہ نکاح و طلاق وغیرہ پیش ہوں گے ان کو بھی پنچائتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان مسلمان ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرہ سماعت میں داخل کر دیا ہے اصلاح معاملات کے لئے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچائتی سسٹم قائم کر کے اس کو ان ریاستوں سے تسلیم کر لیا جائے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو مجالس وضع قوانین میں کسی مسودہ قانون کو پیش اور

لے حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضا و قضانی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ پنچائتیں اپنے فیصلے نافذ کرنے کا اقتدار رکھتی ہوں اور ان کے اختیارات سماعت محض ثالثانہ نہیں بلکہ حاکمانہ نوعیت کے ہوں تو مذہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضا و شرعی سے حکم میں ہوں گے۔

پاس کر لینا اسلامی اغراض کے لئے ہرگز سود مند نہ ہوگا۔

## ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت

انتظام قضاہ شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے۔ اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعتاً کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے تاکہ محاکم شرعیہ یا پنچائتوں میں موجودہ انگریزی ٹیڈن لار کی جگہ اس کو رواج دیا جاسکے۔ مصر میں جب مخلوط عدالتیں (Mixed Tribunals) قائم کئے گئے تھے، تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعہ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ حکومت مصر کے ایبار سے قدوسی پاشا کی صدارت میں علماء ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا۔ اور مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے چیدہ چیدہ علماء چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں۔ اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودے کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علماء

لے اس مجموعہ کا ترجمہ فرینچ زبان میں (Droit Mussalman) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اور دوسرے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کو عدالتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کی رائے دریافت کی جائے۔ پھر ان اکرار اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے۔ اور جب یہ ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو اسے احکامِ شریعیہ کا مستند مجموعہ قرار دے کر یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور انگریزی عدالتوں کے نظائر اور غیر اہل علم و ایمان ججوں کی تشریحات سے جو محمدؐ ن لار تیار ہوا ہے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

کہا جاسکتا ہے کہ جب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں ہے بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرورت مخالفت کی جائے گی۔ اس لئے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرنے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منشر ہیں۔ قدیم طرز بیان و انداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں اور ایسی زبان میں ہیں جس کی اصطلاحی باریکیوں کو اب عموماً وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے جو ان کتابوں کی درس دیتے ہیں آج کل قانون کی کتابوں میں جس طرح احکام کو دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے اور پھر ہر دفعہ کے نیچے اس کے خاص خاص الفاظ کی تشریح، اس کے مقصد کی توضیح، اس کے تحت آنے والے جزئیات کی تفصیل دی جاتی ہے اور معتبر حکام کے نظائر اور مختلف ماہرین کی تعبیرات جس طرح منقح صورت میں درج کی جاتی ہیں، اور فہرستوں اور انڈیکسوں سے مسائل کے تلاش کرنے میں جو آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں

ان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ کرے گا کہ انسانی کوششوں سے تدوین و ترتیب کے فن میں یہ جو ترقی ہوئی ہے۔ اس سے کتب فقہیہ کی تدوین جدید میں ضرورہ کام لیا جانا چاہیے۔ آخر قدیم طرز تدوین کوئی مخصوص اور مشرورع طرز تو نہ تھا کہ اس کی پابندی لازم اور اس سے تجاوز گناہ ہو۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفیذ موقوف ہے اس پر کہ۔

اولاً جس اسلامی معاشرے میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کے اصلاحی، تمدنی معاشرتی اور معاشی حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں، وہ کس ماحول میں رہتے ہیں، اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں، ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوتا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے۔ ذریعہ کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات، اور ان کے طبقہ کی عام حالت، سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے۔ کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے

جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے اور اصولِ قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو۔ چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقرط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا موسم، مریضوں کے الگ الگ مزاج اور امراض کی جداگانہ کیفیٹوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکماتے قدیم کے مرتب کئے ہوتے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی، مگر وہ اس لئے کب مرتب کئے گئے تھے کہ جاہل و غلط ان کو برتیں۔ انہیں استعمال کرنے کے لئے بھی علم، تجربہ، حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمہ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کئے ہیں وہ بھی اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو نفقہ ادرتدبتر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا، جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چراسی ہر لفظ پر لگا تا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے تحت کسی مرد یا عورت کا مجباً بد اخلاقی میں مبتلا ہونا یا سوسائٹی میں موجبِ فتنہ و فساد بن جانا قریب قریب محال تھا۔ اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرہ اسلام سے نکل جائے۔ لیکن آج ہم



دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفاسد  
 حتیٰ کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر مقدمات  
 میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لئے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنے محال  
 ہو گیا ہے۔ فقہ اور تدبیر نہ مفقیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں، ان میں سے  
 کوئی بھی نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک، جس سوسائٹی اور جس خاص ہنڈ  
 میں نافذ کر رہے ہیں۔ اس کی کون کون سی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر اس حکم کے عموم  
 میں اصولی شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ شریعت کے  
 مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے۔ اور اس کے اصول میں سے کسی  
 اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے، ان کی  
 معذوروری تو ظاہر ہے۔ رہے علماء تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد  
 ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے  
 ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں اور بعض کو اگرچہ  
 اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے لیکن فرداً فرداً ان  
 میں سے کسی میں بھی ایسی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقہ سے کام لے کر کسی قدیم  
 جزئیہ کی عبارت سے یکسر مو بھی انحراف کر جائیں۔ کیونکہ ایک طرف خود نہیں  
 اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرأت سے باز رکھتا ہے اور دوسری  
 طرف یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ دوسرے علماء کی طرف سے ان پر غیر مقصدیت  
 کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صورت کے حلیل القدر  
 اور با اثر علماء کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت اثر

سے کام لے کر شرعی معاملات کے لئے ایسا ضابطہ مرتب کرے جو مسلمانان ہند کی موجودہ اخلاقی، تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو۔ اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جاسکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو غیر مقلدیت قرار دیتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ اسے اتنا وقوف بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلہ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلہ نبی اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھالی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح، ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانہ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا، مگر اس کے بعد حرام ہو گیا ہے لیکن اس طرح کی تقلید علماء سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لئے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ یا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حقیقت سے خارج نہ ہوئے۔ علماء احناف نے امام اعظم رحمہم کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک

کر کے بعض کو مفتی اور قرار دیا مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علماء احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور حسبِ ضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے مذاہب سے مسائل اخذ کر کے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا۔ کسی میں یہ جرات نہیں کہ ابواللیث سمرقندی، شمس اللامہ سمرخسی، صاحب ہدایہ، تاضی خاں، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو محض اس بنا پر غیر مقلد کہہ دے کہ انہوں نے مذاہبِ حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی، اور جن معاملات میں اس مذاہب کے بعض احکام کو موجبِ ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابلِ عمل پایا، ان میں دوسرے مذاہب فقہیہ کے مطابق فتویٰ دیا، اور اس بات کو مذاہبِ حنفی کے اصول میں داخل کر لیا کہ بوقتِ ضرورت مذاہبِ غیر پر حکم اور فتویٰ دینا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں اتنا ہی ہرگز نہ ہو۔

اس میں شک نہیں اگر لوگ بطورِ خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذاہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے خواہشات کی پیروی، مختلف مذاہب نے اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے جو رخصتیں خاص خاص حالات میں دی ہیں ان سے نفع

لے خواہشِ نفس کی پیروی

گیری، اور دین کے ساتھ مذاق کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور معاملات میں سخت انتہی پیدا ہوگی۔ لیکن اگر علماء دین، تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کر کے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرنے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں ناوائستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی نیک نیتی کا اجر ان کو دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر مکر بستہ ہوگی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کو اختیار نہ کرنے میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانونِ اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور ان میں قاعوب بالدین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی اور کفر و معصیت کی دباہیں بھیلیں گی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کر لیں گے تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی

لئے دین کا مذاق بنانا اور مسائل دین سے کھینچنے جیسا کہ وہ ٹرکی میں کر چکے ہیں۔

لئے نفی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو آسانی بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لئے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کریں گے۔

# اصولی ہدایات

قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے۔ اس لئے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور جزئیات کے استنباط میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس تانوں کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

۱) لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ  
 حَتَّى يُؤْمِنَتْ (بقرہ - ۲۷)  
 مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب  
 تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ  
 حَتَّى يُؤْمِنُوا - (بقرہ - ۲۷)  
 مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کے نکاح نہ  
 کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ  
 أُزْنُوا الْكِتَابَ (المائدہ - ۱)  
 اور حلال کی گئیں تمہارے لئے اہل کتاب  
 میں سے وہ عورتیں جو محفوظ ہوں۔

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا۔ البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لئے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آسکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

(۲) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ  
 ..... وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ  
 مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو.....  
 ..... مشرک مردوں سے اپنی  
 عورتوں کے نکاح نہ کرو۔  
 (البقرہ - ۲۴)

اس آیت کا مدعا بھی معلوم ہوا کہ مرد تو اپنا نکاح خود کر لینے کا مختار ہے۔ لیکن عورت اس معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے اسے کسی کے نکاح میں دینا اس کے اولیاء کا کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث الْأَيْمُونُ بِنَفْسِهَا مِنْ دَلِيلِهَا اور لَا تَنْكِحُ الْبُكَرَ حَتَّى تُسْتَأْذِنَ کی رو سے نکاح کے لئے عورت کی کھامبھی ضروری ہے۔ اگر کسی کو اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دینے کا حق حاصل نہیں مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے قرآن مجید پر چاہتا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی پسند اور خواہش کافی نہ ہو بلکہ ساتھ ساتھ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) تَمَاتَا اسْتَمْتَعْتُم بِه  
 مِنْهُنَّ فَاتَوْهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً  
 پس جو نازدہ تم نے ان سے اٹھایا ہے اس  
 کے بدلے ان کے مہر ادا کرو۔ ایک فریضے  
 کے طور پر۔  
 (النساء - ۴)

اور تم اپنا دیا ہوا مہر ان سے کیسے چھین لو گے  
 جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز  
 ہو چکے۔  
 وَكَيْفَ تَأْخُذُوهُنَّ وَتَعْتَدُونَ  
 أَنْفُسَ بَعْضِكُمْ إِلَى بَعْضٍ -  
 (النساء - ۳)

اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے اور مہر  
 مقرر ہو چکنے کے بعد ان کو طلاق دی ہو تو  
 وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ  
 أَنْ تَسُرُّهُنَّ وَتَدَّ فَوْضَلَهُنَّ لَمْ يَكُنَّ

نَرِيضَةً فَنُضِفُ مَا فَكَّرْتُمْ  
اس صورت میں مقرر شدہ مہر کا نصف دینا  
(لقبرہ - ۳۱) ہوگا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اس فائدہ کا عوض ہے۔ جو مرد اپنی بیوی  
کی تقاربت سے حاصل کرتا ہے۔ لہذا تقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا  
ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ عورت تو اپنی خوشی سے  
پورا مہر یا اس کا کوئی حصہ معاف کر دے۔ (فَإِنْ طِبَّنَا لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ بِرِئْسَةٍ  
كُنْصًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا) یا طلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ  
عَلَيْهَا فِيمَا افْتَثَتْ بِهِ)۔

وَأَتَيْنَهُمُ آحَةَ الْهَيْجَرِ  
اور اگر تم نے ان کو مہر میں ڈھیر سال  
فِي ظَنَارٍ أَفَلَا تَأْخُذُ وَآمِنَةٌ شَيْئًا  
بھی دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس  
(النسار - ۳) نہ لو۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لئے کوئی حد مقرر نہیں  
کی گئی ہے۔ لہذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔

رَهَ الْرِّجَالُ قَوَّامُونَ حَلَى  
مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس وجہ سے کہ  
النِّسَاءُ بِمَا نُضِلَّ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى  
ان میں سے ایک کو دوسرے پر اللہ نے  
بَعْضٍ دَرِيئًا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ  
فضیلت دی ہے اور اس لئے کہ وہ ان پر  
اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ (النسار - ۴)

اس آیت کی رو سے فقہ مرد پر عورت کا واجب حق ہے اور یہ ان حقوقِ زوجیت  
کا معاوضہ ہے جو رشتہ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق



کسی حال میں ساتط نہیں ہو سکتا آئیہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے یا نشوز (سرکشی) کی ترکیب ہو۔

(۶) لِنُفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّنْ  
سَعَتِهِ رَحْمًا مِّن قَدَرٍ عَلَيْهِ رِزْقُهُ  
خوشحال آدمی اپنی خوشحال کے مطابق نفقہ دے  
اور جس کا رزق نپا تلاً ہو اُسے اللہ نے جتنا  
کچھ دیا ہو اسی میں سے وہ خرچ کرے۔ (الطلاق-۱)

یہاں نفقہ کے لئے یہ تاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کے تعین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائے گا۔ مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے۔ اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق ہے۔

(۷) ذَالِئِیْ تُخَافُونَ نَشْوَزَ  
هُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاصْبِرُوهُنَّ فِی  
الْمَضَاجِعِ وَاصْبِرُوا لَهُنَّ مِثْلَ  
أَطْعَمَكُمْ لَوْلَا تَبَعُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا  
اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو  
ان کو نصیحت کرو، اور خواب گاہوں میں  
ان سے الگ رہو اور ان کو مارو پھر اگر وہ  
تمہاری مطیع ہو جائیں تو ان پر زیادتی کرنے  
کے لئے بہانے نہ ڈھونڈو۔ (النساء-۶)

اس آیت کی رو سے مرد کو مزادینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدم اطاعت کی روش اختیار کرے اور اس صورت میں بھی سزا کی صورت دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجرتی المضایح یعنی ترک صحبت و سر سے ضرب غیر مبرح۔ یعنی ہلکی مار جو صرف انتہا درجہ کے نشوز میں جائز ہے اس حد سے تجاوز کرنا، یعنی بغیر سرکشی کے سزا دینا، یا کم درجہ کی سرکشی پر انتہائی سزا دینا، یا انتہائی سرکشی پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

اور اگر تم لوگوں کو اندیشہ ہو میاں اور بیوی کے درمیان ناجاتی کا تو ایک بیچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بھیجو۔ اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔

(۸) وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا أَحْكَامًا مِنْ أَهْلِهَا وَحُكْمًا مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدُوا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا (النساء-۱)

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو تو برسرِ عدالت ان کے جھگڑے ٹھٹھے جانے سے پہلے یہ تدبیر کر لینی چاہیے کہ ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے اور دونوں مل کر ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

وَإِنْ خِفْتُمْ اور فَأَبْعَثُوا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اس لئے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار بھی اولی الامر ہی کو حاصل ہے۔

پھر اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں میاں بیوی حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت فدیہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔

(۹) فَإِنْ خِفْتُمْ الْإِيقِيْمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا اقْتَدَتْ بِهِ - (بقرہ - ۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت

تقاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں۔ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے اور اس کے لئے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جاسکتی ہے۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

(۱۰) وَلَا تَمْسِكُوا هُتُونَ ضِعْرًا ۗ  
اور ان کو ہزار کی خاطر نہ روک رکھو تاکہ ان  
لِتَعْتَدُوا (بقرہ-۶۹) پر زیادتی کرو۔

اس آیت میں تانوں اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بند نکاح میں اس طرح نہ روکی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) اگر روکا جائے تو معرفت کے ساتھ روکا جائے۔ (وَمَا مَسَاكُ بِمَعْرُوفٍ) مگر جہاں اس کی کوئی امید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ حسب ارشاد نبوی، اسلام کے تانوں میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے۔ لَا ضَرَّ وَلَا نَدْرَ وَلَا ضَرَّ إِلَّا سَلَامٌ۔

(۱۱) فَلَا تَمِيلُوا أَكْلَ الْمَيْلِ  
بس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جھک  
نَتَدَّوْرَهَا كَالْمُحَلَّقَةِ (النساء-۱۹)  
پڑو کہ دوسری کو گویا لٹکتا چھوڑ دو۔



اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہی نہیں کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہہ لیا جائے گا کہ وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو اس پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح جب طاعت کی تکمیل ہو جائے تو دو دھین کے درمیان تفریق کر دی جائے۔

(۱۴) اَلَا اِنَّ يَتَعَفَّوْنَ اَوْ يَعْفُوْا  
الَّذِيْ يَبْدُوْا عَقْدَةَ النِّكَاحِ  
والا یرکب یوہیاں مہر معات کر دیں یا عفو  
سے کام لے وہ شخص جس کے ہاتھ میں  
نکاح کی گیرہ ہے۔ (بقرہ - ۲۱)

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس ناعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عقدہ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے اور وہی باندھے رکھنے یا کھول دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکر کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ مثلاً اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنْ طَلَّقَهَا۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا اگلی اختیار رکھتا ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جاسکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ

اِنَّ سَهْرَ الطَّلَاقِ - ا) لہذا جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے۔ وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (بقرہ - ۳۸) نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اسلامی قانون کے ہر شعبے میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ، اگر اس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں۔ یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ ماضی کو نسخ لے اور تفریق اور تطہیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہا کی ایک جماعت نے یہیداً عَقْدَةُ النِّكَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اور اس قاعدہ میں کوئی استثناء نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں ماضی کو یہ اقتدار نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں تو آدمی کا حق حیات تک اِلَّا بِالْحَقِّ کے ساتھ مشروط ہے کجا کہ اس کے حق طلاق کو ایسا مطلق

لے نکاح توڑ دینا

لے میاں بیوی کو جدا جدا کر دینا

۳۰ طلاق کا اختیار شوہر سے سلب کر کے با اختیار خود عورت کو طلاق دے دینا۔

مانا جائے کہ خواہ وہ ظلم کرے۔ اللہ کی ساری حدیں توڑ دے، اور دوسرے فریق کے سارے حقوق ضائع کر دے، پھر بھی اس کا یہ حق بلا قید و شرط ہی برقرار ہے۔

(۱۵) الطَّلَاقُ مَتْرُوبٌ اطلاق دوبارہ ہے۔ پھر باروک رکھا جائے

فَامَسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بھلے طریقے سے یا رخصت کر دیا جائے

يا حَسَانَ۔ احسان کے ساتھ

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ تَبَعِهَا حَتّٰى تَنْكِحَ رَوْحًا غَيْرَ بِهَا۔

پھر اگر مرد اس کو (تیسری بار) طلاق دیدے تو وہ اس کیلئے حلال نہ ہوگی۔ جب تک کہ

اس کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو۔ (البقرہ - ۲۹)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی مغلظہ۔

## مسائل جُزئیہ

پہلے باب میں اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم اُن جُزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان میں سے ایک ایک اصل کے تحت آتے ہیں۔ یہاں ہم تمام مسائل جُزئیہ کا استقصاء کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جن میں ضروریات و حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے ازسرنو احکام فقہی کی تصریح و توضیح ضروری ہے۔

### ۱۔ ارتداد و احد الزوجین

موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہو گئی ہے۔ بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لئے مرتد ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی اَرْتَدَّ اَحَدُ الزَّوْجَيْنِ وَفَعَلَتِ الْفُرْقَةَ بغيرِ طَلَاقٍ۔ جب زوجین



میں سے کوئی مرتد ہو جائے تو فرقت بغیر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن علماء ہند اس قسم کے ارتداد کی رو کو روکنے کے لئے مشائخ بلخ و سمرقند اور بعض مشائخ حجاز کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے اس فتوے کی بنا اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لئے مرتد بن جاتی ہے اس لئے اس حیلے کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید ان علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی۔

اولاً اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں مرتد اقرار لسانی کا اعتبار کرتے ہیں، اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوتی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہو جائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجہ آخر وَ الْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُذِنَ لَهُمْ أَنْ يَأْتُوا بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔ مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے اس کا مسلمان مرد کے نکاح میں رہنا

لے مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر تو حرام ہو جاتی ہے۔ مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کر سکے۔

تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً جو عورت اسلام کے دائرے سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے، ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو، سکھ کیساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جہالت میں شامل ہو چکی ہے، اس کی مرضی کے خلاف اُسی نکاح پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرے گی جو اُس سے بحالتِ اسلام اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلے میں مشائخِ بلخ و سمرقند کے فتوے سے مسلمان علماء کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فیصدی ایسی ہوں گی۔ جن کے عقیدے میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے۔ درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ ظلم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لئے وادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے۔ مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابلِ نفرت امراض میں یا سخت بے ہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں۔ مگر نبدِ نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود و الجبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت

عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے فقہی جزئیات نکال نکال کر لائے جائیں تاکہ ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لئے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کچھ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کے آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے جہاں تک اللہ اور رسول کے مخصوص احکام تک کا تعلق ہے، ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لئے موجب ضرر ہی ہو کجا کہ موجب ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی ہے، اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمان کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کیا جاسکتا ہے۔

## ۲۔ خیابلوغ

قرآن مجید میں اگرچہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدے کی جو تعبیر فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بالکل ہی بے اختیار ہے۔ بخلاف اس کے حضورؐ نے ایجاباً عورت کو یہ حق

دیا ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے۔ چنانچہ ابو داؤد و نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضورؐ سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کیخلاف میری شادی کر دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تجھ کو رو قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خسار بنت خدام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا۔ حضورؐ نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارقطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضورؐ نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرادی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ رض سے مروی ہے کہ ایک لڑکی نے حضورؐ سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضورؐ نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے نہ کرے۔ اس پر اس نے عرض کیا۔

|  |                                |
|--|--------------------------------|
| یا رسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا ہے اسے | یا رسول اللہ اجزت ما صنع       |
| میں نے منظور کیا۔ میرا مقصد تو صرف عورتوں  | أبی و إنما اردت ان اعلم النساء |
| کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں | ان لیس الی الأباء من           |
| مختار نہیں ہیں۔                            | الامر شیئ۔                     |

مسلم۔ داؤد۔ ترمذی۔ نسائی اور مؤطا میں حضورؐ کا ارشاد ہے۔

لا یتما حق بنفسها من شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے بڑھ کر

لہ لغت میں ایتم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثقیبہ۔ مگر یہاں اس سے ثقیبہ مراد لی گئی ہے۔

دیتھا والیکر تستاذن فی  
 اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق  
 رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے  
 معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

لا تنکح الایمہ حتی  
 شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب  
 تستامرہ لا تنکح البکر حتی  
 تک کہ اس سے اجازت نہ ملے لی جہلے  
 اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ  
 تستاذن۔  
 اس کا اذن نہ لے لیا جائے۔

### ۳۔ ولایت اجبار

اوپر جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں  
 کہ اصول شریعہ میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی رضا مندی  
 ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا کوئی ولی  
 کر دے تو کیا اس صورت میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی  
 کا دخل ہو، ساقط ہو جائے گا؟ اس مسئلے میں ہمارے فقہانے یہ فتویٰ دیا ہے کہ  
 اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہوگا  
 کہ بالوغت ہونے پر اسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر باپ یا  
 دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہوگا۔ الایہ کہ باپ دادا کا یہی الاختیار ہونا ثابت  
 ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ وہ فاسق یا بے حیا ہے۔ یا اپنے معاملات میں سوء تدبیر اور

ناعاقبت اندیشی کے لئے مشہور ہے۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر جا براء نہ حق حاصل ہے، اور ان کے کئے ہوئے نکاح کو لڑکی بالغ ہونے پر نا منظور نہیں کر سکتی، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے، بلکہ محض فقہاء کے اس تکیاس پر مبنی

۱۔ مبسوط میں امام مرفعی نے لے دے کہ صرف ایک حجت پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بحالت نابالغی کیا تھا۔ پھر جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بالغ ہوئیں تو حضورؐ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ تمہیں اس نکاح کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے، حالانکہ اگر نابالغہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا تو جس طرح قرآن مجید کی آیت تخییر نازل ہونے پر آپؐ نے ان کو اختیار دیا تھا اسی طرح اس معاملے میں بھی ضرور اختیار دیتے (المبسوط ج ۴ ص ۲۱۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ولایت اجبار کے حق میں بڑی تلاش کے بعد بھی اس کو رد دلیل کے سوا کوئی دلیل کتاب و سنت سے نہیں لائی جاسکتی ہے۔ اور یہ دلیل اتنی کوڑ رہے کہ ہمیں شمس المائتہ مرفعی جیسے شخص پر حیرت ہے کہ انہوں نے کس طرح اتنے بڑے ایک اہم مسئلے کی جس کا اثر بے شمار عورتوں سے ہمیشہ کے لئے ایک حق مسلوب ہو جانے کی شکل میں مترتب ہوتا ہے، اس دلیل پر بنا رکھنے کو درست سمجھا یہ کہنا کہ حدیث کی رو سے باپ کے کئے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہے، اگر صحیح ہو سکتا تھا تو اس صورت میں ہو سکتا تھا، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالغ ہو کر اپنے والد کے کئے ہوئے نکاح کو نا منظور کیا ہوتا۔ یا اس کے مقابلہ میں خیار بلوغ (باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

ہے کہ باپ دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے لڑکی پر ان کا کیا ہوا نکاح

(تفسیر حاشیہ ص ۱۱۳) استعمال کرنے کا حق مانگا ہوتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ جواب دیا ہوتا کہ نہیں، اب تمہیں یہ حق نہیں رہا، کیونکہ تمہارا نکاح نابالغی کے زمانے میں تمہارے والد نے کیا تھا۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی روایت میں یہ تک مذکور نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالفاظ صریح یہ کہا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں دیا۔ سارے استدلال کی بنیاد صرف اتنی سی بات پر رکھی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اختیار دینا چونکہ کسی روایت میں نہیں بیان ہوا ہے، لہذا یہ فرض کیا جائے گا کہ آپ نے ان کو اختیار نہیں دیا، اور چونکہ آپ نے ان کو اختیار نہیں دیا لہذا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسی لڑکی کو اختیار کا حق حاصل ہی نہیں ہے۔

اس بوردی دلیل کو پیش کرتے وقت شمس الاممہ کو نہ تو یہ یاد رہا کہ کسی واقعہ کا روایات میں مذکور نہ ہونا اس واقعہ کے پیش نہ آنے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ انہیں یہ خیال آیا کہ جو لڑکی بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ کے فعل پر راضی تھی، جس نے اس پر کسی ناراضا مندی کا اظہار نہیں کیا تھا جس نے باپ کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کرنے کا سرے سے مطالبہ ہی نہیں کیا تھا، اگر اسے خیار نہیں دیا گیا تو آخر یہ اس بات کی دلیل کب بن سکتا ہے کہ باپ کے مقابلہ میں لڑکی کو خیار بلوغ سرے سے حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسی دلیلوں سے اگر حقوق سلب ہونے لگیں تو ایک شخص یوں بھی استدلال کر سکتا ہے کہ چونکہ فلاں موضع پر فلاں شخص کو (جس نے پانی سرے سے مانگا ہی نہ تھا) پانی نہیں دیا گیا، اس لئے (باقی ص ۱۱۳)

لازم ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

فَلَا خِيَارَ لَهُمَا بَعْدَ بُلُوغِهِمَا لِأَنَّهُمَا كَامِلَا الْوَرَى  
وَأَمَّا الشَّفَقَةُ فَيَلْزِمُ الْعَقْدَ بِمَا شَرْتَهُمَا كَمَا إِذَا بَاشَرَا  
بِرُضْنَهُمَا بَعْدَ الْبُلُوغِ -

لیکن یہ فرض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد وحیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔  
اولاً حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کسی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد کیا

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۱) کسی کو پانی نہیں دیا جانا چاہیے۔

اس سے بھی عجیب تر شمس الائمہ کا یہ استدلال ہے کہ اگر لڑکی کو باپ کے مقابلے میں خیار بلوغ حاصل ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طلب کے بغیر بھی ان کو یہ خیار ضرور دیتے، کیونکہ آیت تخییر کے نزول کے بعد آپ نے ان کو خیار عطا کیا۔  
دوسرے الفاظ میں شمس الائمہ کا استدلال یہ ہے کہ جو کام ایک معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا صریح حکم آنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہی کام ایک دوسرے معاملے میں بھی آپ ضرور کرتے در آخر لیکہ اس معاملے میں اللہ نے آپ کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔

علماء کہ ام چاہتے ہیں کہ ایسی کمزور باتیں محض اس دھونس کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے مان لی جائیں کہ جو انہیں نہ ماننے کا اس پر غیر مقلدیت کا ٹھپا لگا دیا جاتے گا۔



قبول کرنے کا اختیار ہے۔ اس حدیث سے نابالغہ کے لئے خیارِ بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ میں چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں، اس لئے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لئے لازم نہیں ہے۔

تانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو، لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا حق کلیتہً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھ کر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں کیسا ہے اگر کسی کے "کامل الرائے" اور "ادافر الشفقت" ہونے کی بنا پر اس کو ولایتِ اجبار حاصل ہو سکتی ہے تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہئے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اس کے لئے ثابت کی جاتی ہے۔ لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایتِ اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟ ثانیاً، باپ دادا کا دافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے۔ محض کثرت کو دیکھ کر ایک قیاس قائم کر لیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں، جن سے دفرِ شفقت کا ثبوت کم اور کامل الرائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا ایک نیتی کے ساتھ دفرِ شفقت اور کامل الرائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کس لڑکے سے کر دیں، اور لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کیخلاف نالائق نکلے خصوصاً یہ زمانہ میں جب کہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔

تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت برے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مرتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کسبی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بد اخلاقیوں اور بُری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت باپ دادا کی ولایت اجاز خود ان کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا ایسی الٰہی اختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کر سکے کیونکہ ایسی حالت میں اس کو برسرِ عدالت اپنے باپ دادا کے خلاف بد نیتی، فسق و فجور، بے حیائی، سوء تدبیر اور حماقت و بلاغت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ اور یہ اس کے لئے نہ صرف مشکل ہے بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے نفع کے اس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جائے۔

۱۔ ہم نے نابالغ لڑکے کا مسئلہ یہاں اس لئے نہیں چھیڑا کہ اسے پھر بھی طلاق کا چارہ کار حاصل ہے۔

## ۴۔ خیارِ بلوغ کی شرائط

اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محلِ نظر ہے۔ بابِ ادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں ان کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرہ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیارِ بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضا مندی کا اظہار کر دے۔ اگر پہلے حیض کا خون نمودار ہوتے ہی اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ بشرط صرت باکرہ کے لئے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ اور نابالغ لڑکے کے لئے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں ان کو خیارِ فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط جو صغیرہ نابالغہ کے لئے رکھی گئی ہے، اس کا ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیارِ فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں بڑے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب

لے شوہر دیدہ عورت۔ اگر کوئی لڑکی بالغ ہونے سے پہلے مرد کی صحبت سے آشنا ہو چکی ہو، خواہ بصورت نکاح یا بصورت زنا، تو وہ بھی ثیبہ ہی کہی جائے گی۔

رونا ہو جاتا ہو اور انا فانا اس میں رائے قائم کرنے کی صلاحیتیں ابھرتی ہوں۔ تاہم مان لیا جائے کہ ایسا ہوتا ہے تو نیتہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیابار بلوغ کو اُس وقت تک کے لئے متذکیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کر دیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آخر باکرہ ہی کو کیوں سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لئے کافی وقت نہ دیا جائے۔ ایک نا تجربہ کار و دشیزہ بہ نسبت ایک نیتہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ نا تجربہ کار ہوتی ہے۔

## ۵۔ مہر

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لئے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی۔ مگر ایک عورت نے ان کو لوک کر کہا کہ آیت **وَآتَيْتُمْ أَحَدَ اَهْلِكُمْ نِكَاحًا فَلَا تَلْحُذُوا مِنْهَا** شیعنا کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا:-

امراة اصابت در رجل اخطا۔ ایک عورت نے صحیح بات کہی اور مرد غلطی کر گیا۔

لہذا اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اس میں سے تم کچھ واپس نہ لو۔

پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے قانون میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی توث برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

الزَّوْجُ وَالنَّسَاءُ الْوَجَالُ وَلَا  
عَوْرَتُونَ كَوْمَرَدُونَ كَمَا بَانَ عَيْنِي كَيْ كُوشِشِ  
تَخَالُوفِي الْمَهْرِ  
کہ وادو جہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو بکرؓ نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپؐ نے فرمایا تو کہنتم تعرفون الدرہم من ادریتکم ما ذرتمہ! اگر تم کوندی نالوں میں درہم پہنتے ہوئے ملتے تب بھی شاید تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے۔ حضرت انسؓ نے ایک عورت سے چار اوقیہ (۱۶۰) درہم پر نکاح کیا تو حضورؐ نے منع فرمایا۔ تفتحتون الفضة من عرض هذ الجبل۔ گویا کہ تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں کوئی قابلِ عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے۔ مگر آپؐ کی ازواج اور صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر بھی بارہ اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر متعل کے طور پر لکھ دی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں

کہ کبھی ان کو یہ بہرہ ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لئے موجب فساد ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بقرض فرمایا ہے کہ:-

من تزوج امرأة بصداق  
 بنوی ان لا یودیہ خلو ورائہ وین  
 آذان دینا نیوی ان لا یقضیہ  
 فلو سارق -  
 جس نے ایک سال بہر کے عوض کسی عورت سے  
 نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس بہر کو ادا نہ  
 کرے گا وہ دراصل زانی ہے اور جس نے  
 قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا  
 کرنا نہیں وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے بہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں۔ اس قسم کے بہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ

لے اس حدیث سے بہر کے معاملہ کی جس اہمیت کا اظہار ہوا ہے، ظاہر ہے اس بنا پر میں ایسے تمام لوگوں کو جن کے بہر عام رسم کے مطابق ان کی مالی استطاعت سے بہت زیادہ باندھے گئے ہوں، یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی بیویوں کو بہر میں اس حد تک کمی قبول کرنے پر راضی کریں جسے وہ یک مشت یا باقسط ادا کر سکتے ہوں۔ اور نیک بیویوں کو بھی میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کمی پر راضی ہو جائیں۔ نیز ہر خدا ترس مسلمان کو بار بہر سے سبکدوش ہونے میں حتی الامکان جلدی کرنی چاہیے۔ بہر ایک قسم کا قرض ہے اور اپنے ذمہ جان بوجھ کر یا بے پردائی کے ساتھ قرض چھوڑ کر مر جانا اتنی بُری بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کیا ہے۔

دے سکے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لئے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالاش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لئے وہ غریب معتمد پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتنا جائے تو قریب تریسہ فیصدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لئے اصول تشریح کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ مہر اگر معجل ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کر لیں۔ لیکن اگر وہ مؤجل ہے تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اشامپ پر لکھی جائے اور مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اشامپ لگایا جائے۔ اشامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اشامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخال دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہر مؤجل کا یہ ستر تا پانچ عیب طریقہ باسانی مسدود ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استقامت کے مطابق مہر مقرر کریں اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جامدادی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر

لے جو فوراً ادا کیا جائے۔

لے جو ایک مدت کے بعد ادا کیا جانا ہو۔

دیں۔ حالات کے رد یا صلاح ہو جانے پر یہ شرط اڑائی جاسکتی ہے۔

## ۶۔ نفقہ

اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی تو اسنتظام عیت رکھتا ہو، مگر ندوسے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں اسنتظام عیت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ ناصی اس کو نفقہ ادا کرنے پر مجبور طریقہ سے مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ناصی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے۔ خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں ناصی کو بطور خود طلاق واقع کر دینے کا حق ہے۔ بعض علمائے احناف نے مالکیہ کے اس فتوے کو اختیار کرنا پسند کیا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی ہو۔ یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآن مجید کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ ہی میں اس پر شوہر کو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقد نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے چیز لے کر اس کا بدل اور مال لے کر اس کی قیمت ادا کرنے سے جو شخص انکار



کر دے وہ آخر اس چیز اور اس مال کا مستحق کیسے رہ سکتا ہے؛ جب تک عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے ایسی حالت میں اس کو خود روزی کمانے، یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے، یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصولِ قرض کی غیر ممکن الحصول کو شمش کرنے کی تکلیف آخر اس اصولِ انصاف کی بنا پر دی جائے۔

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گذر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرادی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک ہدایت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی ہدایت دیتے ہیں اور امام احمد کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجہ میں تفریق کرادی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ، **جَزَاءُ مَا أَفْعَوْا مِنْ**  
**أَسْوَ الْإِثْمِ** میں بیان کیا گیا ہے، **وَاللَّهِ تَلَاثَةٌ** کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دارقطنی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے حضرت علیؑ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تاہم بعض میں سے

سعید بن مسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔

بجائے اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ **وَمَنْ قُلٌّ رَحْمَتِهِ رِزْقًا فَلْيَنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا رِزْقًا** (۱) جس کو نپا تارزق دیا گیا ہو اس کو اپنی اسی استطاعت کے مطابق نفقہ دینا چاہیے جو اللہ نے اُسے دی ہے۔ اذٰں کسی متنفس کو اس سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا، جس کی قدرت اس نے اسے عطا کی ہو، لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لئے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے، کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عودیت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور ایک شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے، اور شرعی حق دوسری چیز، نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے تو نہایت قابلِ تعریف ہے لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانونِ اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عودیت کے بلند مقام پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلے میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب

عام مالک کا ہے، جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

## ۴۔ ستم ناروا

آیت کریمہ وَالَّتِي تَخَافُونَ كُفْرَهُنَّ فَاعْطُوهُنَّ مَا فِي بُحْرَانِ هُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْرِبُوهُنَّ ۚ فَإِنِ اطْعَنَكُمْ فَلَا تَبْتَغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا۔ (النساء - ۶)

کی رُو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزار جسمانی ہو یا آزار لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے۔ اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانون اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ تاحضیٰ کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت اور ناقابل برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ شوہریت کے معنی یہ سمجھے جا رہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا خیر محد و لائسنس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ مار پیٹ اور کالم گلوچ کی عادت کو خلع کے جائز اسباب میں شمار کیا جائے اور ایسی عورتوں کو بلا معاوضہ خلع دلویا جائے جن کے شوہروں کو اس عادت کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔

## ۸۔ تحکیم

اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا آپ نے قرآن مجید کے فرمان فَاَنْعَثُوا اَحْکَامًا مِنْ اَهْلِهِ وَحُكْمًا مِنْ اَهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں پھر دونوں حکموں کو مخاطب کر کے فرمایا ۲ تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملا دو اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔ پھر عورت سے دریافت فرمایا کیا تو ان دونوں بچوں کے فیصلہ پر راضی ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا، اس نے کہا اگر وہ ملا دیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر اپنے فرمایا۔ کَيْسَ ذَٰلِكَ لَکَ لَسْتَ بِبَارِحٍ حَتّٰی تَرْضٰی بِمَثَلِ مَا رَضِیْتَ بِہٖ۔ تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو۔ تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں ایسی چند دفعات کا اضافہ کیا جائے جن میں تحکیم کے طریقے اور حکیم کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔ اسلامی قانون میں یہ ایک بڑی قیمتی چیز



چنانچہ ابن جزئی نے القواہین میں عیب مذکورہ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اذا كان في أحد الزوجين أحد العيوب كان الآخر الخيار في البقاء معه والفرق !! اگر ان عیوب میں سے کوئی عیب عورت یا مرد میں ہو تو فریق ثانی کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ رہنا قبول کرے یا الگ ہو جائے۔

امام شافعی کے نزدیک جنون اور جذام اور برص میں عورت اور مردوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مگر قروح سیالہ فرج، مثلاً التثک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارش میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت اندام نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو جو مانع مباشرت ہوں، یا مرد عنین، یا مقطوع الذکر ہو، تو ایسی صورت میں فریق ثانی کو خیارِ فسخ ہے۔

امام محمد کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیارِ فسخ نہیں ہے مگر عورت کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیارِ فسخ ہے۔ ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے، قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظِ اخلاق، دوسرے زوجین کی باہمی مودت و رحمت یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعاً ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔

لہٰذا وہ زخمِ جن کی وجہ سے فرج سے رطوبتیں بہتی رہیں۔

پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ بات اسلامی قانونِ ازدواج کے اصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لئے مضرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیارِ فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ضرر پہنچانے والے ہیں۔ اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجین کے لئے خیارِ فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ نکاح سے پہلے زوجین کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ ہو، اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر نارضا مندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا مگر بعد میں علم ہونے پر انہوں نے خیارِ فسخ استعمال نہ کیا۔ یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے پاس تو ایک چارہ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے، یعنی طلاق اور اس کے علاوہ دوسرا چارہ کار بھی اس کے پاس موجود ہے، یعنی دوسری شادی کر لینا۔ مگر عورت کے لئے بعض صورتوں میں فقہانے کوئی چارہ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاویٰ ہیں، ان کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے ان پر بحث کریں گے۔

## ۱۰۔ عنین و محبوب و غیرہ

اگر شوہر محبوب ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کرنے کا دعویٰ کرنے کا حق ہے، اور تحقیق حال کے بعد فی الفور تفریق کرائی جائے گی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی بنا پر اسے ایک سال تک علاج کی ہمت دی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر وہ تاور نہ ہو تو تفریق کر دی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے حسب ذیل شرطیں لگائی ہیں۔

(۱) یہ حکم صرف اس صورت میں ہے جب کہ عورت کو پہلے سے اسکے عنین ہونے کا علم نہ ہو۔ لیکن اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا، تو اسے تفریق کے مطالبے کا حق نہیں۔

(۲) اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کر دی تو اس کو مطالبہ تفریق کا حق باقی نہیں رہتا۔

(۳) تفریق صرف اس صورت میں کرائی جائے گی جب کہ شوہر ایک مرتبہ بھی مباشرت نہ کرے گا۔ اور نہ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں

لے نامرد لے مقطوع الذکر



ذہب، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ان شرطوں میں سے کسی کے لئے بھی قرآن اور حدیث میں کوئی سند موجود نہیں ہے۔ اور ہم ان تینوں شرطوں کو درست نہیں سمجھتے۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حاجت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کر لیا تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کیساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں ایسی نادان عورت کے لئے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اس کو ہر سے محروم کر کے تفریق کر دیا جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا۔ اور اس نے ابتداءً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کر دی، تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں جس کی بنا پر اس کو تمام عمر مصیبت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جائے ایک نا تجربہ کار دوشیزہ ابتداءً میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبیعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے۔ میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی مگر بعد میں اس کو ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں، جن کا اسے پہلے احساس نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے مصیبت ہونے کے خوف پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دے کر اس کی زبان پکڑ لی جاسے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتداءً میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو ستر ستر کر مر جا یا آبرو

باختہ بن کر زندگی گزار جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلے گئے۔ اور سلسلوں میں منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے۔ دراصل سماج کی حقیقت تفریق میں اس کا بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اس عورت کو دی جاسکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے گل یا جزد و ہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بھی میرے نزدیک زیادتی ہے۔ کیونکہ سزا کا مستحق تو وہ شخص ہے جس نے نامرد ہونے کے باوجود نکاح کیا۔

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا اسلام کا قانون کسی آسانی مخلوق کیلئے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لئے ہے اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت وجہ دشوار ضرور ہے کہ بس ایک یا دو چار مرتبہ شوہر کی صحبت سے متمتع ہو جانا ان کے لئے کافی ہو اور اس کے بعد مدت العراس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گزار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر سچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیمہ سچاس فی صدی عورتوں کا حشر کیا ہو گا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے متعلقے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لئے حلال کے دروازے بند کر کے انہیں حرام کے انسانوں

پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں نامردی کی ہر شکایت پر مرد خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیئے اور اگر کافی علاج کے بعد جس کے لئے ایک سال کی مدت مناسب ہے یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کر دینی چاہیئے۔

فقہائے کرام نے یہ لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بے جا شدت پائی جاتی ہے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لئے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کر دینی چاہیئے۔

فقہاء نے خصی کے لئے بھی وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لئے رکھا گیا ہے یعنی اس کو بھی علاج کے لئے ایک سال کی ہہلت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور محبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانبشین، دونوں صورتوں میں وظیفہ زوجیت کے لئے وہ یکساں نااہل ہوتا ہے اور کوئی علاج اس کی کھوتی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہذا خصی اور محبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہیئے۔

## ۱۱۔ جنون

جنون کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے۔ اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جائے۔ فقہاء نے اسی کو لیا ہے اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس جنون کے لئے ہے، جو نکاح سے قبل جنون تھا اور نکاح کے بعد ہم بستری پر نہ آوے نہ ہو۔ اس لحاظ سے گویا وہ عین ہے اور اسی لئے اس کو ایک سال کی ہہمت دی جاتی ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں جنون اگر حادثہ ہو تو اس کو علاج کیلئے ایک سال کی ہہمت دی جائے گی، اور اگر مُطَبَّق ہو تو وہ محبوب کے حکم میں ہے، بلا تاخیر تفریق کر دی جائے گی۔

امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادثہ اور مُطَبَّق دونوں میں ایک سال کی ہہمت بغرض علاج دی جائے گی اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو، تو تفریق کر دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسبِ ذیل شرطیں لگاتے ہیں۔  
(۱) اگر نکاح سے پہلے جنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح

لے یعنی جس کے دورے کبھی پرتے ہوں۔ ۲ یعنی دائماً حالت جنون طاری ہے۔

۳ یعنی ہہمت دینے بغیر۔

کیا تو وہ تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ مجنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا۔

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گذر چکا ہے ان کا کوئی ماخذ کتاب و سنت میں نہیں ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ شریعت، تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا ہو تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر دیا جائے اگر نکاح کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ لیکن بعد میں اس کے لئے روحانی جسمانی تکلیفیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو درحقیقت اس نے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ، رنج تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریفانہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس

کی خیرگیری کی اور سابق کا ساتعلق زین و شوہر اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا۔ تو اس سے یہ کیوں لازم آجائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بے چاری کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں آناجینون ہویدا ہوں، وہ فوراً اس کی تمام پھیلی عینیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کر لے اور اس کو چھوڑ کر چل جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابلِ برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت یہ وفاداری و رفاقت بلائے جان ثابت ہوگی اور اس کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟

اس قسم کی شریطیں عائد کرنے میں مرد کے حقوق کا بہت مبالغہ آمیز تصور اختیار کیا گیا ہے اور دوسری طرف عورتوں کے ساتھ بڑی سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بیکار ہو جائے یا جنون میں مبتلا ہو، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو، تو مرد اسے طلاق دے سکتا ہے، یا دوسری شادی کر کے اپنی زندگی خوش گوار طریقہ سے بسر کر سکتا ہے، لیکن مردان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت نہ تو اسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کر سکتی ہے۔ اس کے لئے بجز تفریق کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارہ کار پر بھی ایسی پابندیاں عاید کر دی جائیں، جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لئے رہائی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اُس عدل اور توازن کے خلاف ہوگا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے ایسے تمام

معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لئے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیے۔ عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرر اور تعدی نہ ہو اور حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف نہ ہو، لیکن اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہیے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا پاگل یا آشک زدہ، یا جذاہی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجز وکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لئے ضرر اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت زبردستی اس حالت میں رکھی گئی ہو، اس کے لئے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کیلئے کس قدر دشوار ہے۔

## ۱۲۔ مفقود الخیر

مفقود الخیر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ واظفنی نے اپنی سنن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: **أَمْرَاتُ الْمَفْقُودِ أَمْرَاتُهُ**  
 حضور نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے۔ جب تک کہ اس کا حال معلوم

لے ایذا رسانی، تکلیف دہی لے زیادتی

حَتَّىٰ يَأْتِيَهَا الْبَيِّنَاتُ  
 نہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مصعب اور محمد بن شمر جیل ہمدانی کے واسطے سے پہنچی ہے جو مجروح ہیں ابن شمر جیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ اذہ یسوری عن المغيرة منا كيرا با طيل لہ اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین ہیں ابن شمر جیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن شمر جیل اس حدیث کو مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں کیسے ممکن تھا کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمرؓ و عثمانؓ غنی رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کلیتہً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

لے وہ مغیرہ سے ایسی باتیں روایت کرتا ہے جو منکر اور جھوٹی ہوتی ہیں۔



صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کی اُراء اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیبؓ، زہریؓ، نخعیؓ، عطارؓ، کحولؓ اور شعبیؓ کی ہے۔ امام مالکؓ نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمدؓ کا میلان بھی اس کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود الزمیر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔ سفیان ثوریؓ، امام ابو حنیفہؓ اور امام شافعیؓ رحمہم اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لئے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس بستی یا اس کے ملک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے پھر مختلف بزرگوں نے اپنے اپنے اندازے کے مطابق انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے کہ ایک انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہے اس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۳۰ سال کی عمر میں مفقود ہو تو اس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال، اور بقول بعض ۷۰ سال، اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول بعض ۵۰ یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں اب اگر اس وقت عورت ۲۰ سال کی تھی تو سب سے زیادہ جن بزرگوں نے اس کے ساتھ عیادت فرمائی ہے، ان کے فتوے کے مطابق وہ ۶۰ برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کا انتظار

کرے۔ پھر اسے نکاح کی اجازت ہے۔

اس مسئلے میں جب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور یہی اسلامی قانون کی روح اور اس کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے **فَلَا تَعْبُدُوا أَكْلَ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ** ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیوں کہ پسند کر سکتا ہے؛ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلاہ کرو تو زیادہ سے زیادہ چار بھیجے تک ایسا کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہوگا۔ یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب بن جائے پھر **وَلَا تَنْسِكُوهُنَّ خِوَارًا** فرمایا گیا جس کا منشاء صاف طور پر یہ ہے کہ رشتہ ازدواج میں ضرر نہ ہونا چاہیے، اور ظاہر ہے کہ مفقود الخیر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حکم دینے میں انتہا درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابل غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ **اگر حد اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضائقہ نہیں۔** یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتہ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جس عورت کا شوہر بیسوں سے مفقود ہو اس کے لئے حد و اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ ان تمام احکام کے اصول اور ان کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخیر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معلق چھوڑنا درست نہیں ہے۔

### ۱۳۔ مذہب مالکی کے احکام درباب مفقود

علمائے احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخیر کے مسئلے میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتوے دینا پسند کیا ہے۔ لہذا اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقہانِ روم کی تین صورتیں ہیں اور ہر ایک کے احکام جدا جدا ہیں۔

(۱) مفقود نے اپنے پیچھے انسا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دے گا۔ بلکہ تحقیق حال کے بعد بلا انتظار اس کو اختیارِ خودِ طلاق دے دے گا۔ یا اسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر آپ طلاق وارد کرے۔ شافعی اور حنبلی مذاہب بھی اس مسئلے میں مالکی مذہب کی

ملہ تطہیق کیلئے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریہ سے فرمایا تھا کہ اَنْتِ اَمْلِكُ بِنَفْسِكَ اِنْ شِئْتِ اَقَمْتِ مَعِ زَوْجِكَ وَاِنْ شِئْتِ  
(باقی صفحہ ۱۴۳)

تائید کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک عدم نفقہ بجائے خود تفریق کے لئے کافی ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جو ان ہے اور اس کو کسی طویل مدت کے لئے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جتنی مدت مناسب سمجھے انتظار کرنے کا حکم دے گا۔ اس باب میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے بلکہ بعض شدید صورتوں میں متاثر اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو جائز رکھا ہے۔ نیز خوفِ معصیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود مُنہ چھوڑ کر کہہ دے کہ مجھے اس شوہر کی قیدِ نکاح سے آزاد کر دو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت فقدا ان زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے اور دعوے کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گزار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے اسے مدتِ انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہیے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

(فقہ حاشیہ ص ۱۴۲) قارقیتہ، یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے، خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اس سے جدا ہو جائے۔

(الف) اگر مفقود بلادِ اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

(ب) اگر وہ میدانِ جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

(ج) اگر وہ کسی مقامی فساد کے سلسلے میں کھویا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اس کی تلاش کے لئے امکانی کوشش کی جائے گی، پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدت و فوات گزارنے کی اجازت دیدی جائے گی۔

(د) اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان بھی نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو عدتِ تعمیر گزارنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدتِ تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض ۷ سال کہتے ہیں، بعض ۸ سال اور بعض ۵ سال۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علمائے احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہبِ مالکی کی ان شرائط کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور فقدانِ زوج کی تمام صورتوں میں چار سال تک انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے، خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات

یعنی ایک اوسط درجہ کے انسانی کا حقیقی عمر پانا متوقع ہو۔

کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں، ہر فائدہ الزوج عورت کے لئے چار سال کی مدت انتظار پر اصرار کرنا مصالحِ شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا۔ غیر اسلامی طریقوں کے رواج نے اُن تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہواتِ نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے اسلام نے قائم کی تھیں۔ عریاں تصاویر ہیں، معتقدانہ ناول اور فکٹے ہیں، ریڈیو کے جنون نیز گانے ہیں جن سے کوئی شخص شہرں اور قصبوں میں رہتے ہوئے بچ ہی نہیں سکتا۔ اور ان سب پر مزید یہ کہ قانونِ ملکی نے زنا کو جائز کر رکھا ہے پھر پردے کے شرعی حدود عملاً باقی نہ رہنے کی وجہ سے غیر محرم مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی شخص کے لئے ضبطِ نفس اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہو گا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود الخیر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت میں رجوع کرے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے۔ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرت عورتوں ہی کے لئے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے مضر نتائج ساری قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود الخیر کے متعلق مذہبِ مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجراءِ احکام میں فائدہ الزوج عورت کی عمر، اس کے ماحول اور اس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے جس کو حالتِ انتظار میں گزارنے کے بعد اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو۔

## ۱۳۔ حکم بصوت واپسی مفقود

اس سلسلے میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر مفقود عدالت کی دی ہوئی مدت انتظار ختم ہو جانے کے بعد واپس آجائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمرؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکاح ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آ گیا تو وہ اسی کو ملے گی، لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو دونوں صورتوں میں شوہر اول کا اس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک نے مؤطا میں حضرت عمرؓ کے اس قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب مالکی کا مفتی بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہما کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خواہ دوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور سچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید برآں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دوسرے شوہر سے اس عورت کو ہر بھی دلا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہما کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام مالک نے نزدیک حضرت عمرؓ کا رجوع ثابت نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو پھر شوہر اول واپس آجائے تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہیے یا نہیں؟ اگر اس نے ہر واپس لینے یا معاف کر لینے کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے شوہر سے جدا ہو کر عدت طلاق گزارنی ہوگی۔ پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی اور

دوسرے شوہر سے اس کو بہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہی سب سے بہتر ہے جس سے امام مالک نے استناد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورت کا نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اول کا حق اس پر قائم رہے تو کون ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چھین جائے بلکہ اس کو ہر بھی دینا پڑے اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ بر باد ہو اس قسم کی شرائط عائد کرنے میں عورت کے لئے غایت درجے کا ضرر ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکا دینے والی مدت انتظار گزار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پروا حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی رہے، اور اس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گزارنی پڑے۔

## ۱۵۔ لِعَان

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں لِعَان واجب آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فریقین کو مخاطب کر کے تین مرتبہ فرمایا:۔ **اللَّهُ أَشَدُّ أَنْ أَحَدٌ كَمَا كَذِبٌ فَهَلْ مِنْكُمَا مَن تَأْتِي - اللّٰهُ**



خوب جانتا ہے، کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟“ جب دونوں نے توبہ سے اعراض کیا، تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا گیا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت، پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا: **ذَٰكُمُ التَّفْرِيقُ بَيْنَ كُلِّ مَثَلًا عَيْنٍ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِذَا اتَّعَوْا قَالَا يُخَيَّمُكَانَ أَبَدًا**۔ یہ ہے تفریق کا طریقہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لئے۔ اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ شوہر نے عرض کیا کہ جو مال میں نے اس کو مہر میں دیا تھا وہ واپس دلویا جائے۔ آپ نے جواب دیا: **لَا مَالَ لَكَ إِنْ كُنْتَ صَدَقْتَ وَعَلَيْهَا فِيمَا اسْتَمَلْتَ مِنْ فَرْجِهَا وَإِنْ كُنْتَ كَذَبْتَ كَذَّابًا**۔ مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تمتع کا معاوضہ ہے جو تو اس سے اٹھا چکا ہے اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔“

حضورؐ کے اس فیصلہ سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں۔

- ۱۔ لعان قاضی کے سامنے ہونا چاہیے۔ عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔
- ۲۔ لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں کوئی

ایک قصور کا اعتراف کرنے۔ جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں تب لیعان کرایا جائے۔

۳۔ فریقین کی طرف سے لیعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کرے گا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی گئی ہے۔ جہور کا خیال یہ ہے کہ لیعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کی رائے ہے کہ تفریق کے لئے حکم حاکم ضروری ہے۔ تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لیعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا اعلان فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے محض ملامت کو فرقت کے لئے کافی نہیں سمجھا۔

۴۔ لیعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو کسی طرح نہیں کر سکتے اس معاملہ میں تحصیل کا وہ قانون بھی جاری نہیں ہوتا جو حتیٰ تنکح زواجاً حیواناً میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ لیعان سے ہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہ صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر دسے چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لیعان کرنے سے انکار کرے تو جہور کی رائے میں اس پر حد مذمت جاری کی جائے گی، اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا۔ اسی طرح اگر شوہر کے لیعان کر چکنے کے بعد عورت لیعان سے انکار کرے تو شامعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اس کو رجم کیا جائیگا،

اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس کو قید کیا جائیگا۔ اس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور صنبی بر مصلحت ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لیجان سے انکار کرنے کا جرم مستلزم سزا قرار دیا جاسکے، اس لئے مرد و ست ضابطہ شریعی میں اس کے لئے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لیجان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو اسے ہر سے خردم کر دیا جائے۔ یہ صرف اس وقت تک ہونا چاہیے جب تک ہم پر ایک غیر مسلم حکومت مسلط ہے اور ہم خود اپنے قوانین تعزیرات جاری کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

## ۱۶۔ تطلیقات ثلاثہ در مجلس واحدہ

بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے اہل سنت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاقِ رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاقِ مغلظہ کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو

اے ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینا۔

حضرت عفتہ میں اگر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ اُبْلَعَبِ بِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَيْنَ  
 اَظْهُرِكُمْ کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمہارے  
 درمیان موجود ہوں؟ بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اس فعل  
 کو معصیت فرمایا اور حضرت عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص  
 ان کے پاس مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اس کو در سے لگانے لگتے۔  
 اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی  
 بیویوں کو جھٹ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش  
 کرتے پھرتے ہیں، کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے  
 کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات  
 باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے  
 گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے  
 کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جُدا کر دینے پر ایسی پابندیاں  
 عاید کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر  
 اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی  
 گئی ہوں، عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے اور ہرجانہ کی مقدار  
 کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی  
 روک تھام کی نکل سکتی ہیں۔ جن کو ہمارے علماء و ماہرین قانون غور و خوض کے بعد  
 تجویز کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مسئلے کو کثرت سے لوگوں میں شائع کرنے

کی ضرورت ہے کہ یہ فعل ناجائز ہے تاکہ جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ آگاہ ہو جائیں۔

---

## خاتمہ کلام

اس رسالہ میں اسلامی قانونِ ازدواج کے مقاصد اور اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمانانِ ہند کے لئے مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حل مشکلات کے لئے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو بعینہ قبول کر لیا جائے۔ انسانی راستے میں بہر حال خطا اور صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی راستے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحیِ خداوندی کی طرح واجبِ اطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر ہے کہ قرآن مجید اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانونِ ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابر صحابہ و ائمہ مجتہدین نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ان پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کر لیں۔ جو ہمارے نزدیک اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ اب یہ اہل علم اور اصحابِ فکر و رائے کا کام ہے کہ وسعتِ نظر اور کتاب و سنت میں تدبیر سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں۔ اور اگر کوئی چیز صواب نظر آئے تو اس کو

محض اس بنا پر رد نہ کر دیں کہ لکھنے والا بدقسمتی سے پورے ترقی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسوداتِ قانون کے متعلق بھی جملہ اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلے میں حیدرآباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب مسودات تشنہ اور ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے غیر لکتی ہیں اس قسم کے مختصر مسودات سے ان خرابیوں کو دور نہیں کیا جاسکتا جو اینگلو محمدی کے تقاض اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نظائر اور موجودہ عدالتی نظام کے طریق کار سے پیدا ہو گئی ہیں اگرچہ چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا بعض مسائل میں جزئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی، تو اس سے وہ حکام عدالت کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے جو قوانین شریعت اور مذاہب فقہیہ کے جزئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے اور جن کے دماغوں پر وہی اینگلو محمدی لار کی سپرٹ مستط ہے۔ اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خاص کر ازدواجی معاملات کے لئے ایک مفصل ضابطہ مدون کیا جائے جیسا کہ ہم اس رسالہ کے گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کام

لے یہاں ان مسودوں کے بعض نفسِ مضمون سے بحث ہے اس سے بحث نہیں کہ آیا جس قانون ساز کو بجائے خود کوئی "اسلامی قانون" پاس کرنے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے جو قانون یہ پاس کریں، خواہ وہ لفظ بلفظ شریعت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، بہر حال وہ شرعی قانون نہیں ہو سکتا۔

آسان نہیں ہے، وقت اور محنت چاہتا ہے۔ اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں ہے اس کے لئے اصحابِ علم و راستے کی ایک منتخب جماعت کو ایک کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ وہ محض تنقید میں کی کتابوں سے جزئیات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بلکہ اُمت کے اربابِ حل و عقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ قوانینِ شریعت کی ایسی تعبیر کریں۔ جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے بین اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے۔



## ضمیمہ نمبر ۱

# ایک نہایت اہم استفتاء

ہمارے پاس دہلی سے ایک صاحب نے ایک مطبوعہ استفتاء بھیجا ہے جس کا موضوع بچائے خود نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہمارے اکابر اس مسئلہ کو غیر شرعی طریقہ پر حل کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔  
ذیل میں استفتاء اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے۔

ماہرین علوم اسلامیہ و مقتدیانِ شرع متین سے حسب ذیل سوالوں کا مدلل جواب کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں جلد مطلوب ہے۔

۱۔ اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پانچ مسلمان مرد و عورت کے نکاح کو اسلامی احکام کے مطابق فسخ کر دے، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پانچ عورت پر مرد کا ظلم ثابت ہو جانے کی صورت میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دیدے، جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان تقاضی کو یہ حق حاصل ہے تو کیا نکاح فسخ ہو جائے گا، اور عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی، اور بچہ کو شرعیاً حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نکاح اور ایقاع طلاق کو شرعاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو، دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

(۷۲) اگر سوال مذکورہ القدر کا جواب نفی میں ہو یعنی شرعاً غیر مسلم کے حکم فسخ نکاح اور ایقاع طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور غیر مسلم کے فسخ نکاح یا ایقاع طلاق کے بعد بھی وہ عورت شوہر اول کی زوجیت میں باقی رہتی ہے، تو اس صورت میں جو عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے گی، اور اس دوسرے مرد کو یہ علم بھی ہو کہ اس عورت نے غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پچ کے ذریعے سے طلاق حاصل کی ہے، تو وہ نکاح باطل و فاسد ہو گا یا نہیں؟ اور دوسرے مرد سے نکاح کے باوجود اس عورت کا دوسرے مرد سے زنا و شوہر کا تعلق رکھنا حرام ہو گا یا نہیں؟ اور دونوں شرعاً زنا کے ترکیب سمجھے جائیں گے یا نہیں؟

(۷۳) اور دوسرے مرد سے نکاح باطل ہونے کی صورت میں جب اس دوسرے مرد سے کوئی اولاد ہوگی تو وہ ولدا الحرام ہوگی یا نہیں؟ اور یہ اولاد اس دوسرے مرد کے ترکے سے محروم ہوگی یا نہیں؟

مہربانی فرما کہ ان سوالوں کے جواب نمبر وار مدلل تحریر فرمائیے۔ الخ  
اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صورت غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بنے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں، اس کو خدا کا قانون جاننا تسلیم کرنا ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف وضع و تفریق کے معاملات کے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اصولی حیثیت سے ان معاملات کی نوعیت دوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

صرف نکاح و طلاق کے معاملات میں نہیں، بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رُو سے غیر مسلم ہے۔ اسلام نہ اُس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک، یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ خود مختارانہ قائم ہوتی ہو، نہ اس قانون کو تسلیم کرتا ہے جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو، نہ اُس عدالت کے حق سماعت و فصل خصومات کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک و فرمانروا کے ملک میں اس کی اجازت (Sanction) کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رُو سے اُن عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "تاج" کی اجازت کے بغیر قائم کی جاتیں۔ ان عدالتوں کے جج، ان کے کارندے اور وکیل، اور ان سے فیصلہ کرنے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو بادشاہ ارض و سما کی مملکت میں اس کے سلطان، "چارٹرڈ" کے بغیر قائم کیا گیا ہو، اور جس میں اس کے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو، ایسا نظام عدالت مجرم مجرم ہے۔ اس کے جج مجرم ہیں، اس کے کاکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اس کے سامنے اپنے معاملات لے جانے والے مجرم ہیں اور اس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں، اگر ان کا فیصلہ کسی خاص معاملہ میں شریعت اسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے، کیونکہ بغاوت اس کی جڑ میں موجود ہے بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں، تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور اور زانی اور شرابی اپنے جرم سے اس سزا کی بنا پر پاک نہ ہوں

گے اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پر کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہوں گی، کیونکہ انہوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کئے جو خدا کے قانون کی رُو سے ان کو حاصل نہ تھے۔

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہ قائم رہتی ہے جبکہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان ان کی کُرسی پر بیٹھا ہو۔ خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لے کر جو شخص مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسان کے بنائے ہوئے قانون کی رُو سے احکام جاری کرتا ہے، وہ کم از کم جج کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے۔ بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر مجھلا اس کے احکام کا عدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟

یہی قانونی پوزیشن اُس صورت میں بھی قائم رہتی ہے، جب کہ حکومت جمہوری ہو اور اس میں مسلمان شریک ہوں، خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں تیسری التعداد ہوں یا

۱۹۴۵ء کے آخر اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں حکومت ہند نے اُن فوجی افسروں پر چلائے، جنہوں نے برما و ملا یا پر جاپانی قبضے کے دوران میں "آزاد ہند ریاست" اور "آزاد ہند فوج بنالی تھی" خصوصیت کے ساتھ شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں کے مقدمے میں ہندوستانی کے ایڈووکیٹ جنرل نے استغاثہ کی جو تقریر کی تھی وہ لہجہ پڑھنے کے لائق ہے۔ کیونکہ اس میں ان نام نہاد باغیوں کے مقابلہ میں حکومت ہند کی جو قانونی پوزیشن بیان کی گئی تھی، وہ حقیقت وہی تمام اصلی و حقیقی باغیوں کے مقابلہ میں سلطنت رب العالمین کی قانونی پوزیشن ہے۔

کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری لادینی اصول پر نظام حکومت قائم کیا ہو، بہر حال جس حکومت کی بنیاد اس نظریہ پر ہو کہ اہل ملک خود مالک الملک (Sovereign) ہیں اور ان کو قانونِ الہی سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لئے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی رعیت اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور اس کے بالمقابل اپنی خود مختار حکومت قائم کر لے۔ جس طرح ایسی حکومت کو اُس بادشاہ کا قانون بھی جائز تسلیم نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اس نوعیت کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہوں گی، خواہ ان کے جج قومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کے فیصلے بھی اسی طرح کا عدم ہوں گے، جس طرح کہ صورتِ اول و دوم میں بیان کئے گئے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا اس کی صحت پر پورا قرآنِ دلیل ہے۔ تاہم چونکہ مسائل نے کتاب و سنت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لئے محض چند آیاتِ قرآنی یہاں پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلقِ اسی کی ہے۔ لہذا نظرہ امر کا حق (Right to rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی خلق پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔

لہٰذا یہ کہ کوئی اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت اختیار کرے اُس کے قانونِ شرعی کے مطابق حکمرانی اور فیصلہ کرے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

کہوئے اللہ، مالک الملک، تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

وہ ہے اللہ تمہارا رب، ملک اسی کا ہے۔

بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں (Partner) ہے۔

لہذا حکم اللہ بزرگ و برتر ہی کے لئے خاص ہے۔

اور وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا حصہ دار نہیں بناتا۔

خبردار خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔

لوگ پوچھتے ہیں۔ کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہہ امر سارا کا سارا اللہ کے لئے مخصوص ہے۔

(۶) اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے بالکل سلب

کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، بندہ اور محکوم ہے اور اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہے اس کے (حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

قُلِ اللَّهُمَّ مَا بَكَ الْمَلِكِ  
تُوعِي الْمَلِكِ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ  
الْمَلِكَ مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران - ۳)

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ  
الْمُلْكُ (ناظر - ۲)

لَقَدْ يَكُونُ لَهُ شَرِيكٌ فِي  
الْمُلْكِ (نبی اسرائیل - ۱۲)

فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَلِيمِ  
(المومن - ۲)

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ  
أَحَدًا (الکہف - ۴)

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ  
(اعراف - ۷)

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ  
مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ

(آل عمران - ۱۶)

قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کو قی قانون بنا تا ہے، یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، وہ طاغوت ہے، باغی اور خارج از اطاعت حق ہے۔ اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اس کے فیصلے پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے۔

وَلَا تَقْمُوا إِلَىٰ مَا تَصِفُ  
الَّذِينَ كَفَرُوا هَذَا لِجَلَالِ  
وَأَمَّا أَنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ  
رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ  
أَوْلِيَاءَ

اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو ان کے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے (Lawful)  
اور یہ حرام (Un-lawful)

(المحل - ۱۵)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف آتا رہا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے پھیرنے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔ (واعرف - ۱)

لے قانونِ الہی کی حدود کے اندر تلباط و اجتہاد سے تفصیلاً تقبی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے جو یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو، ان میں روجِ شریعت اور مزاجِ اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے کیونکہ ایسے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق ضوابط و احکام مقرر کرنے کا قانونی حق اہل ایمان کو ہے دیا گیا ہے۔

اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے  
جو اللہ نے اتارا ہے۔ تو ایسے تمام  
لوگ کافر ہیں۔

اسے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو  
جو دعویٰ تو کرتے ہیں اُس ہدایت پر ایمان  
لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے نبیوں پر اتاری  
گئی ہے اور پھر جانتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا  
فیصلہ طاغوت سے کریں۔ حالانکہ انہیں حکم  
دیا گیا تھا۔ کہ طاغوت سے کفر کریں یعنی اس  
کے حکم کو تسلیم نہ کریں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ  
اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔  
(المائدہ - ۷)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ  
يَدْعُونَ أَنَّهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنْزَلَ  
إِلَيْكَ وَمَا أَنْزَلَ مِنْ قَبْلِكَ  
يُؤِيدُونَ أَن يُبَدِّلُوا كِتَابَ اللَّهِ  
إِلَىٰ لُغَاؤِهِمْ وَقَدْ أُنزِلَ أَنْ يَكْفُرُوا  
بِهِ۔

(الفساۃ - ۱۹)

(۱۳) خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور صحیح عدالت صرف وہ ہے جو اس  
قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اسی  
کا نام خلافت ہے۔

اور ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لئے بھیجا  
ہے کہ حکم الہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔  
اسے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق  
نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اُس  
رہنمائی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے  
تمہیں دکھائی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا  
لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (النساء - ۶۹)  
إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ  
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا  
أَرَسَكَ اللَّهُ۔

(النساء - ۱۶)



اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں نغز میں مبتلا کر کے اُس ہدایت کے کسی جز سے نہ پھیریں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے.... کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے لہذا تم حق کیساتھ لوگوں کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ ورنہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو بھٹکا لے جلتے گی۔

وَإِنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ دَاخِرَةً وَإِن تَقِمْ وَتَكُن مِّنَ الْمُقِيمِينَ  
بَعْضُ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ .....  
أَفَكُمُ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْعُونَ  
(المائدہ - ۵۰)

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاتَّبِعْ أَمْرَ اللَّهِ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ  
فَيُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ  
(ص - ۲)

(۴۴) اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو، بلا لحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں کتنی ہی مختلف ہوں، ان کے تمام افعال بے اصل اور باطل ہیں۔ ان کے حکم اور فیصلہ کے لئے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان Charter عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں، خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کا عدم ہے۔ چارٹر سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو خدا کو مالک الملک اور اپنے آپ کو (بانی حق) پر



وئے نبی! ان سے کہو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی محنت گئی و یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود و رفائے الہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی، اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کی طاقات (اس کے سامنے حاضر ہو کر حساب لینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ اس لئے ان کے سب احکام ضبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

تِلْكَ عَادٌ جَبَّحُوا بُيُوتَهُمْ  
رَبِّهِمْ وَعَصُوا أَوْسُلُ  
وَأَتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ -  
یہ عادی جنہوں نے اپنے رب کے احکام  
ماننے سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی  
اطاعت نہ کی اور ہر جبار دشمن حق کے امر کا  
اتباع کیا۔ (سورہ - ۵)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا  
رُسُلًا مِّنْ بَيْنِ أُولَئِكَ  
وَمَلَائِكَةٍ فَاتَّبَعُوا أَمْرًا فُضُوعًا  
وَمَا أَمْرًا فُضُوعًا بِدَشِيذٍ -  
اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح روشن  
سلطان کیساتھ فرعون اور اس کے احمقان  
ریاست کے پاس بھیجا مگر ان لوگوں نے ہمارے  
فرستادہ شخص کے بجائے فرعون کے امر کی پیروی کی  
حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا یعنی مالک  
(سورہ - ۹)

وَلَا تَطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن  
اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو

ہم نے ذکر سے یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک  
سکے ہم اس کے بت میں ہنخاں کر رہے ہیں جس نے  
اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جبکہ امر حق سے  
ہٹا ہوتا ہے۔

اسے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کاریوں  
کو، خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور معصیت کو، اور حق  
کے بغیر لکیر و سر سے پر زیادتی کرنے کو، اور اس  
بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت) یا الوہیت  
میں ان کو شریک کرو۔ جن کے لئے اللہ نے  
کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔

اور تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی بندگی کرتے ہو وہ  
تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے انگوٹوں  
نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی  
سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صروت اللہ کے  
لئے خاص ہے اسکا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو  
اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کر سے در آخالیکہ  
راہ راست اس کو دکھادی گئی اور ایمان داروں  
کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے اس کو ہم  
اسی طرف چلا دیں گے جبہر وہ خود مر گیا اور

وَجَسُونَا وَاَتَّبَعِ هَوَاهُ وَاَنْ  
اَمْوَا مُرَطَا  
(الکھف-۴)

قُلْ اَتَمَاعَرَ مَرَّ رَقِي الْفَوَاحِشِ  
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ  
وَالْبِئْسَ بَعْضُ الْعَمَلِ كَانَتْ  
تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَهُمْ يَنْتَرِلُ  
بِهٖ سُلْطٰنًا

(اعراف-۴)

وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهَا  
اِلَّا اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَاٰبَاؤُكُمْ  
مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ سُلْطٰنٍ  
اِنْ اَلْكُمْ اِلَّا اللّٰهُ اَمْرًا اَلَّا تَعْبُدُوْا  
اِلَّا اِيَّاهُ - (يوسف-۵)

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ جَعَلَ  
لِذُنُوْبِهِ سُلْطٰنًا وَاِنَّ اللّٰهَ  
يَهْدِيْ سَبِيْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ  
لِيُوْتِيَهُمْ اَمْوَالَهُمْ وَيُضَلِّهٖمْ  
جَهَنَّمَ

اسے جہنم میں بھجھائیں گے اور وہ بہت ہی  
بڑا ٹھکانا ہے۔

وَسَاءَتْ مَصِيْرًا -

(النساء - ۱۶)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے  
جب تک کہ اے نبیؐ تجھ کو اپنے باہمی اختلافات  
میں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ  
حَتَّىٰ يُحْكُمُواكَ فِي مَا شَجَرَ  
بَيْنَهُمْ - (النساء - ۸)

اور جبکہ کیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے  
آمارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے  
منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے چھڑک رہے  
ہیں۔

وَإِن تَوَلَّوْا لَنُنَزِّلَنَّ  
مِنَ السَّمَاءِ آيَاتًا  
مَّا نَسْتَلِ اللَّهُ إِلَيْكَ  
رَسُولًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ  
يُصَدِّقُونَ عَمَلَكَ صِدْقًا

(النساء - ۹)

اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے  
باغیوں) کیسے الہ ایمان (یعنی اپنی وفادار عیال)  
پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ  
عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا -

(النساء - ۲۰)

یہ قرآن کے حکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے اسلام کے نظام  
اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر متشابہ رہ جاتا تو  
قرآن کا نزول ہی معاذ اللہ بیکار ہوتا۔ اس لئے قرآن نے اس کو اتنے صاف اور  
قطع طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ اس میں دو راہیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے  
اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رجوع کریں۔  
پھر جب کہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ  
نے جس چیز کے لئے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے، اور اللہ کے سلطان

سے بے نیاز ہو کر جو چیز بھی تاغم کی گئی ہو اس کی تلافی حیثیت سراسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریاخت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اس معاملہ میں بھی کسی غیر الہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچے کا نطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اس کے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بال بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ خنزیر کی بچہ پورا پورا حرام ہے تو اس کی کسی بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں پس یہ سوال کرنا کہ فرسخ نکاح، اور تفریق بین الزوجین، اور ایقاع طلاق کے بارے میں غیر الہی عدالتوں کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے یا نہیں، اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم جموں کے بارے میں کیا جائے۔ گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الہی نظام عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں، ان کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا، حالانکہ خنزیر کے جسم کی بوٹی کا نام "بکرے کی بوٹی" رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الہی حکومت کے سخت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لئے اسلام کے اولین بنیادی اصول میں ترمیم تو نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان اگر غیر الہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصول اسلام میں ترمیم کرنے یا بالفاظ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ ترمیم ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں اس سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام

کو چھوڑ کر کسی آسان طریق زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ایسے جیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصول حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔



## ضمیمہ نمبر ۲

## یورپ کے قوانین طلاق و تفریق

(تُعْرِفُ الْأَشْيَاءَ بِأَضْدَادِهَا) اسلامی قانونِ ازدواج کی جو تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر پوری طرح اس قانون کی شانِ کمال کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کے مقابلہ میں دنیا کے اُن قوانین کا مطالعہ نہ کیا جائے جن کے متعلق ترقی یافتہ قوانین ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسان جب خود اپنا قانون ساز بنتا ہے تو کس قدر ٹھوکریں کھاتا ہے۔

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کا ایک بلند ترین نصب العین پیش نظر رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف افراد کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالم واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا

چیزیں اپنی ضد سے چھپائی جاتی ہیں۔



کوئی قاعدہ اور کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ان سب کا اسلام میں، نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو برس سے یہ قانون مختلف زبانوں میں مختلف تمدنی حالات اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے اور کہیں کسی شخصی یا اجتماعی تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا، یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود سعیِ ملیغ، اس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدالی اور توازن اور متناسب میں اس کے لگ بھگ بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الہی حکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے لازمی اقیدمات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، حال مستقبل پر یکساں نظر رکھے، ما بال فعل اور ما بالقوہ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام ابنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل و مناسبت کیساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں، ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا، کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے۔ کہیں اشخاص کے حقوق

اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا، کہیں فرد اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے، غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر متغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ان میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا متبع رہ کر عملاً ان کی پابندی آزاد ہو جائے۔

الہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں اور شہرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کئے جاتے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی ناقابل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھا یا تھا، وہی صحیح تھا۔ اُس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے، وہ سب غلط اور ناقابل اتباع نکلے۔ اگرچہ عالم تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے اور زبانیں اب بھی ان کی ناکامی کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ مگر عملاً دنیا ان قوانین کو توڑ رہی ہے جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابل ترمیم سمجھتی تھی، اور آہستہ آہستہ ان اصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کئے تھے، لیکر بعد از خرابی بسیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلے کو لے لیجئے جس پر ابھی چند سال پہلے تک مسیحی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعن دیتی تھی، اور بہت سے عرب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جراب بن نہاتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازواج

کے مقدس رشتے کو ناقابلِ انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق و فسخ و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ نعل نہ تھا۔ بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظام تمدن کی نخلح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مضمر تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ:-

”جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے (متی ۱۹: ۶)“

مگر مسیحیوں نے نبی کے اس قول کا منشا نہ سمجھا اور اسے اخلاقی ہدایت کے بجائے قانون ازدواج کی اساس بنا لیا۔ انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابلِ عمل قانون کے خلاف جیلوں اور مکرو فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی۔ پھر خلافت و رزی قانون کی عادت بد نے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی حدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں ان کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا۔ آخر کار انسانوں نے مجبور ہو کر اُس قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں۔ جسے عدلی سے وہ خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ اصلاحی قدم اس وقت اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پروان مسیح کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی کسی چیز کا بھی احترام باقی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں کی بدولت مسیحی دنیا میں طلاق اور فسخ و تفریق کا ایک طوفان اُٹھ آیا، جس کی شدت سے خاندانی نظام کو ”مقدس“ دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۵۷ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۳۲ء میں چار ہزار سے اوپر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۷ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا امریکہ جہاں ۱۸۸۶ء میں ۳۵ ہزار

تفریقیں ہوتی تھیں، وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۳ ہزار مقدس رشتے قطع کر لئے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ۵۰ اشدیوں میں سے ایک کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح نے جو تعلیم دی تھی اسی سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ - **الَّذِينَ يَتَّقُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ رَاقِعًا لَعْنَةُ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوَصَّلَ وَيُفْسَدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ** (البقرہ - ۳)

مسیح نے یہودیوں کی سخت دلی اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لئے کہا تھا کہ -

”جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسرا بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔“ (متی ۱۹: ۹)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی غرض کے لئے اس سے زیادہ سچے تلے الفاظ میں طلاق کو **الْبَيْعَاتُ** فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھہرایا۔ مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص کی تعلیم کے لئے تھے تاکہ وہ اپنے گل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انہی کو بے نسبت لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلم اخلاق ہی نہ تھے، بلکہ صاحب شریعت بھی تھے۔ اس لئے آپ نے اصول اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں

لے جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں نسا دبر پا کرتے ہیں، یقیناً وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصولی اخلاق و مقتضیاتِ فطرتِ انسانی کے درمیان کس طرح توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بحالات اس کے مسیح علیہ السلام صاحبِ شریعت نہ تھے بلکہ اجرائے شریعت کی نسبت اُن سے پہلے ہی دنیا میں اُن کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا تھا اس لئے ان کے ارشادات میں اخلاق کے ابتدائی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زندگی کے عملی مسائل پر اُن اصولوں کا صحیح انطباق اگر ہو سکتا تھا تو موسوی شریعت کی روشنی ہی میں ہو سکتا تھا۔ مگر مسیحی یہ سمجھے اور سینٹ پال نے اُن کو یہ سمجھایا کہ اصولوں کو پالنے کے بعد اب ہم الہی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ چرچ کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر خود قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لئے گمراہی میں ڈال دیا۔ مسیحیت کی روہنزا رسالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جنہے اصول دین بتائے تھے، ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی قومیں ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مسیح نے طلاق کی جو برائی کی تھی، اس میں حرام کاری کا استثناء کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مطلقاً بری چیز نہیں بلکہ سببِ جائز کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اسے اوپر والی آیت جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے۔ سے متعارض سمجھ کر بعض نے تو یہ راستے قائم کر لی کہ استثناء بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے

لے جائز کاموں میں سب سے زیادہ بُرا کام

تو یہ راستے قائم کر لی کہ یہ استثنا بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری" کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق تو کرادی جائے مگر رشتہ نکاح بدستور قائم رہے یعنی دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی۔ منجملہ دوسرے قوانین کے یہ قانون بھی مسیحی قوموں کے اندر بد اخلاقی کے رواج کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔

حظوظ یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ادا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial Separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے مگر دونوں نکاح ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔ کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Cannon Law) میں مذکورہ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتہ نکاح کا کامل انقطاع، جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہو، قطعاً ممنوع تھا۔ البتہ تفریق کے لئے چھ صورتیں تجویز کی گئی تھیں۔

(۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری (۲) نامردی (۳) ظالمانہ برتاؤ (۴) کفر (۵) ارتداد (۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارہ کار تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ کون صاحب عقل اس بارے کار کو مطابق عقل کہہ سکتا ہے؟ دراصل یہ کوئی قانونی چارہ کار نہ تھا۔ بلکہ ایک مہزمتی جس کے خوف سے لوگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لیجاتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ اور اگر کسی قضا کے بارے ہوئے جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی، تو اسے لامحالہ  
 لڑھوں کی ہی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدتِ العمر حرام کاری میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔  
 اس شدید اور ناقابلِ عمل قانون سے بچنے کے لئے مسیحی علماء نے بہت سے شرعی  
 حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر ”چرتھ“ کا قانون ایسے بد نصیب زوجین کا نکاح  
 فسخ کر دیتا تھا۔ منجملہ ان کے ایک جہلیا یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے، کہ زوجین  
 نے مدتِ العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا، وہ بلا ارادہ ان سے سہر زد ہو گیا تھا، ورنہ راصل  
 ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لئے رشتہ ازدواج میں منسک ہونا تھا، یعنی  
 متعہ، تو اس صورت میں مذہبی عدالت فسخ نکاح، یا بالفاظِ صحیح تر بطلانِ نکاح Nullity  
 کا اعلان کر دے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رُو سے بطلانِ نکاح، کے معنی کیا ہیں یہ کہ زوجین  
 میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان  
 سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارہ کار پہلے سے  
 بھی ذلیل تر تھا۔

روسی چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church)

نے، جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ سوانح ملے ہیں، نسبتاً ایک بہتر  
 اور قابلِ عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بند نکاح سے زوجین کو حسبِ ذیل وجوہ  
 کی بنا پر آزاد کیا جاسکتا ہے۔

- (۱) زنا اور اس کے مقدمات (۲) ازداد (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو تیس کی
- حیثیت سے مذہبی خدمت کے لئے وقف کرنا (۴) بغاوت (۵) نشوز (۶) نامردی
- (۷) جھڑن (۸) برص و جذام (۹) طویل مدت کے لئے قید ہونا (۱۰) نفرت باہمی یا شدید

ناموافقیت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے وہ کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لائے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتہ نکاح بجز موت کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لئے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے۔ ۱۹۱۲ء کے رائل کمیشن کے سامنے بشپ گور (Bishop Gore) نے مشرقی کلیسا کی فقہ سے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا مقلد ہے۔ ۱۹۳۰ء کی لمبیجھ کانفرنس (Lambeth Conference)

میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح نہیں کر سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ انگریزی اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراض خبیثہ میں مبتلا ہو یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اس نے شوہر سے اپنے حمل کو مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آئے تو عورت کے لئے مذہبی حیثیت سے کوئی چارہ کار ہے نہ مرد کے لیے۔

یہ تو تھانہ مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک بے درپے بڑے بڑے علما اور فقہا پیدا ہوئے مگر اب ہمیں ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہو گئی معنی اس کا ارشاد کے دل و دماغ پر ایسا گہرا اثر کیا کہ امتداد زمانہ تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقا، انسانی فطرت کا مطالعہ



عینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں اور ہزار برس کی طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقشے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر ان روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعین قانون کے کارناموں پر بھی ڈالی جائے جنہوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لئے خود اپنے علم کے بل بوتے پر ازواجی قوانین بنائے ہیں۔ انقلاب فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزاد عقیدہ اور آزادانہ فکری ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اس قانون کے نقائص کو محسوس کیا، اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کئے جاسکتے، دوسرے سے اس کا جواہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا (۱۷۹۲ء میں) اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سویٹزرلینڈ وغیرہ نے بھی مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جدا گانہ قوانین نکاح و طلاق وضع کر لئے جن میں قانونی تفریق اور فرسخ کے علاوہ طلاق کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک حجمِ غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہونا براہِ راست نتیجہ ہے اس تنگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علماء ایک ناقابلِ عمل خلاف

فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مستطرد رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا، محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا۔ لیکن پادریوں نے اس کو خدا کی قانون کی طرح مقدس اور ناقابلِ ترمیم قرار دیا۔ انہوں نے اس کی کھلی ہوتی غلطیوں، مضرتوں، اور خلافتِ منتقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا محض اس لئے کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمہ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے حتیٰ کہ انہوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذہب بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی۔ نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ ”ہم مغربی چرچ کے مفکر ہیں نہ مذہبی پیشواؤں کے اس طرزِ عمل نے مغربی قوموں کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار باقی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابلِ اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانونِ ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے، دراصل یہی پادریانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد و دہریت اور لامذہبی کی طوط دھکیل دھکیل کر لے گئی ہے۔ مذہبی قانون سے آزاد ہوجانے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اسی سال کے اندر جو ازدواجی قوانین وضع کئے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں ماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور تجربات کی روشنی میں پے درپے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور امتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک امی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے پیش کیے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو ان تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انہیں رومن چرچ کے ابتدائی باپوں سے وراثت میں ملے ہیں

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجیے ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ، دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوں، اس وقت تک ہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورہ بالا دو وجوہ کے ساتھ ایلا (یعنی قطع زین و شوہر (Desertion) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا، بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق (یعنی عقدہ نکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا مگر اس کے لیے لازم کر دیا گیا کہ مرد عدالت سے رجوع کرے، بطور خود وہ طلاق نہیں دے سکتا اور اسی طرح عورت کے لیے بھی لازم کیا گیا کہ اگر وہ طلاق لینا چاہے تو گھر کے گھر ہی میں مرد سے معاملہ طے نہیں کر سکتی، بلکہ بہر حال میں اسے بھی عدالت سے ہی رجوع کرنا ہوگا۔ پھر عدالت کے لئے طلاق کی ڈگری دینے کی صورت ایک ہی صورت رکھی گئی، اور وہ یہ کہ اگر مرد طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا قریب زنا ہونا ثابت کرے اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ارتکاباً زنا اور اس کے ساتھ ہی ظالمانہ برتاؤ یا نشور کا بھی ثبوت دے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں بہر حال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام مزدور لگانا پڑے گا اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دے کر ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے ایک فرد کی گواہی دینا پڑے گا۔

ہوگا۔ اس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا۔ عدالتوں کو سناٹھی کے نام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنا دیا، اور پھر عدالت ہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت کو بید اخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید برآں اس قانون نے شوہر کو کو دیوثی کی بھی تعلیم دی، کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہر جانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔ ہر جانہ! یعنی بیوی کی عصمت کا معاوضہ!! متنبع ناجائز کی قیمت، جو قرضاتوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!!!

۱۸۸۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ خطا کار شوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے۔ ۱۹۰۶ء کے قانون میں شوہر کے خطا کار ہونے کی شرط اٹا دی گئی اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری ڈال دے یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا، درانحالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو معنی برانصاف کہا جاسکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جاتے، اور اس سے الگ رہے، تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے روک دے گی، اور اس سے نفقہ دلوائے گی، اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے برے برتاؤ یا تعامل کے سبب سے زنا کی ترکیب ہو تو اس کے خلاف طلاق

کے لئے شوہر کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہو گا۔ ذرا اس کے معنی پر غور کیجئے۔ شوہر کا ظلم ثابت کر کے عورت اس سے الگ جا رہے، شوہر کو پاس نہ پھینکنے دے، خرچ کے لئے روپیہ اس سے لے اور زندگی کا لطف دوستوں سے اٹھائے، پھر اگر شوہر ایسی عورت سے چھپا بھی چھپڑانا چاہے تو نہ چھڑاسکے۔ یہ ہے وہ قانون ازدواج جو انیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کے پے درپے محنتوں سے مرتب کیا تھا۔

۱۹۱۱ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس نے تین سال کی محنت کے بعد ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ اسبابِ طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

(۲) طلاق کے سابق وجوہ میں حسبِ ذیل اضافہ تجویز کیا گیا:

تین سال تک چھڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابلِ علاج جنون جب کہ اس پر پانچ برس گزر چکے ہوں۔ شرابی پن کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی امید نہ رہی ہو۔ وہ قید

لے شرابی پن کے معنی مغربی اصطلاح میں عمدۃً شراب پینے کے نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ شراب پی کر عہدہ کرنے اور دھم پانے اور ریٹ، گاندھلوج اور برسر بازار یہود گیاں کرنے کے ہیں۔

کی مزا جو مہر سے موت سے ضمانت کر کے دی گئی ہو۔

(۳) شہرالی پن کی بنا پر تین سال کے لئے زوجین میں تفریق کرائی جائے اور اگر اس

مدت میں ریلت نہ چھوٹے تو ہزر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراضِ خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور

وہ دوسرے فریق سے چھپا یا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو  
فسخ نکاح کے لئے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدماتِ طلاق کی رپورٹیں دورانِ مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں  
عدالتِ روداد کے جن حصوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو، جو سب سے زیادہ نامعقول تھی، مقبول کر کے

۱۹۲۳ء کے قانونِ معاملاتِ ازدواج (Matrimonial Cases Act) میں

شائع کیا گیا۔ باقی جتنی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں

دی گئی ہے کیونکہ کٹر برمی کے اُسقفِ اعظم اور بعض دوسرے بااثر لوگ ان سے اختلاف  
رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تعلقہ کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ وہ عورت

اور مرد کے ارتکابِ زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے تناصر ہیں۔ ان کی اس غلط

قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں

کی اتنی کثرت ہو گئی کہ عدالتیں ان سے پریشان ہو گئیں اور ۱۹۲۸ء میں لارڈ

مری ویل (Lord Merrwalle) کو ان کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے، وہاں اب تک رشتہ

نکاح ناقابل انقطاع ہے البتہ بعض صورتوں میں ثانوی تفریق ہو سکتی ہے جس کے بعد زوجین نہ مل سکتے ہیں مگر آزاد ہو کر نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ آئر لینڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب فرزا دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napolian) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۷ء میں اس کے لئے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لئے حسبِ بل وجوہ قرار دیئے گئے ہیں۔

زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ظالمانہ برتاؤ، احمد الزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے اس کے ساتھی کی عزت پر حرج آئے، حقوق زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لذت، عدالت سے کوئی ایسی منزا پانا جو موجبِ ذلت ہو۔

علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کیسے تین سو دن کی عدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی نائس تقلید ہے۔

لے عدت کی اصل غرض یہ ہے کہ ایک مرد سے الگ ہونے کے بعد اور دوسرے مرد کی زوجیت میں جانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیا جائے کہ عورت صاف نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے اسلام کا بالکل فطری صورت اختیار کی ہے کہ تین مرتبہ حیض آنے سے اس امر کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ یہ وضع حمل طلاق کے دس دن بعد ہو جائے اس کے مقابلہ میں ۳ سو دن یا ۱۰ مہینے کی عدت کے لئے کوئی فطری بنیاد نہیں ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں تو انہیں طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں۔

آسٹریلیا، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین صرف باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔

جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے بے تعلق ہو کر رہنا موجب طلاق نہیں تاؤنیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ یہ قانون ایٹار کا ایک دھندلا سا عکس ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں اس کے لئے تین سال کی مدت ہے اور ہالینڈ میں پانچ سال کی۔ دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔ مفقود الخبر کے لئے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں ۸ سال۔ دوسرے ممالک کے قوانین مفقود الخبر کے باب میں خاموش ہیں۔

مجنون کے لئے جرمنی، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں تین سال کی ہلت ہے۔ باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

بلجیم میں مطلقہ کے لئے دس مہینے کی عدت ہے۔ فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کی عدت مقرر نہیں کی گئی۔

آسٹریلیا میں احد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزا سے قید پانا دعوت سے طلاق کے لئے کافی ہے۔ بلجیم میں مجرور سزا یا ہونا عورت یا مرد کو اپنے ذہنی کینڈلٹ طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دار بنا دیتا ہے۔ سویڈن اور ہالینڈ میں اس کے لئے جس دوام کی شرط ہے۔

یہ ان قوموں کے قوانین ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر

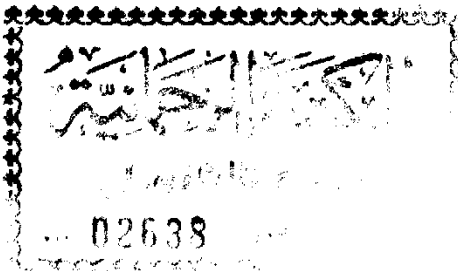
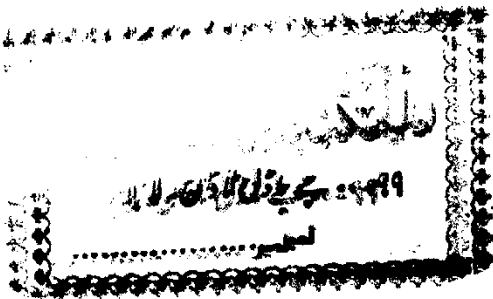


ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی ان کے مقابلہ میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرت انسانی کی رعایت، عقنوں کے سداب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت اور ازدواجی زندگی کے تمام مسائل و معاملات پر جامعیت کے ساتھ عادی ہونے میں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہوا ہے اس کو عشر عشر بھی مغربی قوانین کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ تو انہیں انیسویں صدی کے ”روشن“ زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و مفکرانے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چچان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اس قانون کو اسے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادیہ نشین پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی جماعت ماہرین سے مشورہ نہیں کیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا، مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

پھر اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کے باوجود اگر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایت الہی کی ضرورت سے انکار کئے چلا جائے اور اپنا ہادی و شارح خود ہی بنے

پر اصرار کرتا رہے۔ تو بجز اس کے کہ اس کی اس ضد کو حماقت کہا جائے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اس شخص سے بڑھ کر احمق کون ہو گا جس کو ایک بے غرض اور خیر خواہ رہنما سیدھا راستہ بتانے کے لئے موجود ہو۔ مگر وہ کہے کہ میں تو خود ہی راستہ تلاش کروں گا، اور اس تلاش میں خواہ مخواہ مختلف راستوں پر بھٹکتا پھرے۔



مسلمانوں کے فزخشاں دورِ عروج اور المناک دورِ زوال کی مکمل تصویر

## دکن کی سیاسی تاریخ

سید ابوالاعلیٰ مودودی سے

سید

ابوالاعلیٰ

مودودی سے



\*\*\*\*\*

- منہدیہ دور کی عبرت ناک داستان
- اور نظام الملک آصف جاہ کے کارناموں کی تفصیلات۔
- اعلیٰ ایڈیشن ۲۵-۵ روپے
- سٹائڈیشن ... ۳ روپے
- اعلیٰ ایڈیشن ... ۵ روپے
- سٹائڈیشن ... ۳.۶۵ روپے

## تاریخ افکار و علوم اسلامی

مصنف: علامہ راجبہ الطباخ

ترجمہ: افتخار احمد بلوچ

- علمی میدان میں مسلمانوں کی خدمات اور ان کے کارناموں کی مفصل اور مستند روداد۔

○ اعلیٰ ایڈیشن ۲۵-۱۱ روپے سٹائڈیشن ... ۶ روپے

۱۲-۱۳۔ شاہ عالم مارکٹ، لاہور

۱۴۔ بیتہ المکرم، پہلے منزل، ڈھاکہ

سلیکٹڈ سٹیشنری لمیٹڈ  
اسلامکٹ

کیا اسلام کے معاشرتی اور معاشی نظام میں ضبط و ولادت کی گنجائش ہے؟  
مسئلہ کے ہر پہلو پر مفصل بحث کے لیے

کیا

مفت سے مقید ہوئے

(سید ابوالاعلیٰ مودودی سے)

ضبط و ولادت کی شرعی حیثیت

اعلیٰ ایڈیشن

۲/۴۵ روپے

۱/۴۵ روپیہ

اسلام اور ضبط و ولادت

۲/- روپے

۱/- روپیہ

اسلامی دستور کیا ہے اور دستور سازی میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے؟

اس کو سمجھنے کے لیے

پاکستان میں  
اسلامی قانون  
کی بنیاد کی  
عملی بنیادیں

قیمت  
۸۰  
پے

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مطالعہ کیجئے

اسلامی  
دستور  
کی بنیادیں

قیمت  
۸۰  
پے

۱۳-۱۴ سے، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۱۶- بیٹے المکرم (پہلی منزل، ٹرہانے

سیکشن  
اسلامات

ایمان دین مستحکم

کرنے کے لیے

بہترین کتاب

اسلامی عقائد

اور احکام کی

دشمن تشریح



حصہ دوم

قرآنی واقعات

کی تحقیق و تشریح

اسرائیلی افسانوں کا تجزیہ۔

تہذیب نو کے پیدا کردہ مسائل کا اسلامی حل۔

مغربی فلسفوں کا تجزیہ اور تنقید۔

اعلیٰ ایڈیشن ۱۳۸۱ھ روپے ستائیس - ۱۰/۷۰ روپے

حصہ اول

توحید و رسالت

کے اثبات میں ایمان افروز بحث

مذہبین حدیث کے اعتراضات کا مدلل جواب

قرآن مجید کے مشکل مقامات کی دشمن تشریح

اسلی ایڈیشن : ۹/۲۵ روپے

ستائیس : ۶/۵۰ روپے

حصہ سوم

اسلامی فقہ کی اہمیت اور صحیح مقام

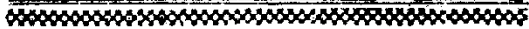
اجتہاد کے شرائط اور اصول

اسلامی احکام کی مدلل تشریح، توضیح

عصر حاضر کے مسائل کا اسلامی حل

دعا کی ایڈیشن : ۸/۲۵ روپے

ستائیس : ۵/۱۰ روپے



۱۰۱۳ھ، شاہ عالم مارکٹ، لاہور

۱۱- پیسٹ الکریم (پہلے منزل) ٹھکانہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

اسلام کو معاشرتی  
اور اجتماعی نظام سمجھنے کے لیے  
**معیاری**  
**کتابیں**

| صفحہ    | تعداد | مؤلف  | نمبر                                |
|---------|-------|---|-------------------------------------|
| ۵ - ۸   | ۳ - ۵ | سید ابوالاعلیٰ مودودی                       | ۱- پردہ                             |
| ۳ - ۳   | ۰ - ۰ | ۰   | ۲- حقوق الزومیین                    |
| ۸ - ۸   | ۰ - ۵ | ۰   | ۳- اسلامی نظام زندگی                |
| ۵ - ۴   | ۰ - ۳ | ۰   | ۴- اسلامی تہذیب کے اصول و مہاری     |
| ۲ - ۲   | ۰ - ۱ | ۰   | ۵- اسلام اور ضبط و ولادت            |
| ۵ - ۲   | ۰ - ۲ | ۰   | ۶- تفسیر القرآن سورۃ الاحزاب        |
| ۲۵ - ۹  | ۰ - ۴ | ۰   | ۷- تفسیرات حصہ اول                  |
| ۲۵ - ۱۲ | ۰ - ۸ | ۰   | ۸- حصہ دوم                          |
| ۲۵ - ۸  | ۰ - ۵ | ۰   | ۹- حصہ سوم                          |
| ۵ - ۲   | ۰ - ۲ | مولانا عبدالعزیز اسلامی                     | ۱۰- اسلام اور اجتماعیت              |
| ۰ - ۲   | ۰ - ۲ | ۰   | ۱۱- فریضہ انامت وین                 |
| ۰ - ۲   | ۰ - ۲ | خلیل احمد عابدی                             | ۱۲- جاوہ و منزل                     |
| ۰ - ۳   | ۰ - ۳ | مولانا ابوالدین اعظمی                       | ۱۳- عورت اسلامی معاشرہ میں          |
| ۰ - ۳   | ۰ - ۲ | ڈاکٹر مصطفیٰ حسینی<br>ترجمہ: محمد شفیع شفیق | ۱۴- اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو |
| ۵ - ۳   | ۰ - ۱ | مولانا مفتی محمد رفیع                       | ۱۵- ضبط تولید کی شرعی حیثیت         |

ط ۱۳- ای. شاہ عالم مارکٹ لاہور (مقرب پاکستان) فونٹ ۶۶۳۳۱  
**اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ**  
 فونٹ: ۱۶- بیت المکرم ایچی منزل (سحاہ مشرق پاکستان) فونٹ ۶۶۳۳۱